ابتدا تیرے نام سے

مہکتے پھولوں کے موسم ابھی ٹھہر جائیں
لہو میں ڈُوبے ہوئے قافلے گزر جائیں
بہار آنے سے پہلے بہت ضروری ہے
جو زخم پچھلی بہاروں کے ہیں وہ بھر جائیں

محترم قارئین! لوڈ شیڈنگ سے مرجھائے ہوئے چہروں پر ایشیا کپ میں پاکستان کی جیت نے مسکراہٹیں بکھیر دیں اور کچھ دیر کے لیے خوشیوں کے رنگ ہر طرف چھا گئے۔ یوم پاکستان کی رونقیں دوبالا ہوگئیں۔

توانائی کے بحران کی صورت بے حد سنگین ہوگئی ہے۔ گھریلو صارفین تو جیسے تیسے صبر کے گھونٹ پی رہے ہیں، مگر صنعتوں کی بدحالی نے کاروباری طبقے کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ فیصل آباد اور سیالکوٹ جیسے بڑے صنعتی مراکز تباہ ہو رہے ہیں، فیکٹریاں اور ملیں تیزی سے بند ہو رہی ہیں، کاروبار ٹھپ ہو رہے ہیں، بھوک اور بیروزگاری گھر گھر ڈیرے جما رہی ہے۔ یہ صورتحال آخر کار لوگوں کو سڑکوں پر لے آئی۔ احتجاج اور جلسے جلوس کا سلسلہ توڑ پھوڑ اور تشدد تک جا پہنچا۔ کئی جگہ عمارتوں اور دفاتر پر حملہ کیا گیا اور قومی املاک کو نقصان پہنچایا گیا۔ مگر اربابِ اختیار گویا طے کیے بیٹھے ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہونا۔ عوام حیران ہیں کہ کس کے پاس جائیں، کیا یہاں کوئی ہے جو اتنی سنگین صورتحال کو حل کرنے کا ذمہ دار ہے؟ یا بس عوام کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ تمام بڑے شہروں میں مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے مگر حکومت کو کوئی پرواہ نہیں۔ حیرت ہے کہ انقلابات اور عوامی بیداری کے اس دور میں، آزادئ صحافت اور آزادئ اظہار، خصوصاً سریع رالبطوں اور سوشل میڈیا کے زمانے میں جبکہ ایک پیغام ثانیوں میں دنیا بھر میں پھیل سکتا ہے، ہمارے عوام خود کو اتنا بے بس محسوس کرتے ہیں۔ عوامی سطح پر کوئی متفقہ لائحہ عمل نہیں بن پا رہا۔ ہمارے اربابِ اختیار یوں بے حس و حرکت ہیں جیسے انہیں یقین ہو کہ یہ لوگ چند مظاہروں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

یہ وقت ہے کہ تاجر تنظیمیں اور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری مل جل کر کوئی مؤثر ملک گیر حکمت عملی اپنائیں جس کے نتیجے میں حکومت بجلی اور گیس کے اس مصنوعی بحران کو دور کرنے پر مجبور ہو جائے۔ ضروری تو یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں اپنے اپنے مفادات چھوڑ کر عوام کی داد رسی کچھیا سر جوڑ کر بیٹھیں، مگر حکومت کے دسترخوان پر دعوت طعام میں شریک جماعتوں سے تو یہ توقع ہی عبث ہے اور میاں نواز شریف کی دوستانہ حزبِ مخالف ابتدا ہی سے زرداری کو بالواسطہ حمایت فراہم کر رہی ہے۔ سو جمہوری تماشے کا یہ فکسڈ میچ کیا بہتری لا سکتا ہے!!

کراچی ایک بار پھر شدت سے سلگ اٹھا ہے۔ ان جانے سمجھوتوں کے تحت ٹھنڈی ہونے والی آگ کو ان جانے منصوبے ہی کے

تحت دوبارہ بھڑکا دیا جاتا ہے اور ظلم کی دہائی شروع کر دی جاتی ہے۔ ہر فریق خود کو مظلوم اور قربانیوں کا پیکر ظاہر کرتا ہے۔ الطاف حسین کے دھمکی آمیز بیانات خاص طور پر اس تمام ہنگامے کے پسِ پردہ مقاصد پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایسے مواقع پر قانون نافذ کرنے والے ادارے منظر سے غائب ہو جاتے ہیں اور کراچی کو پوری طرح مجرموں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ایسے میں حالات پر قابو پانے کا مطالبہ کس سے کیا جائے؟

میں جانتا ہوں لٹیروں کے سب ٹھکانوں کو
شریکِ جرم نہ ہوتا تو مخبری کرتا

امریکی ریاست کیلیفورنیا میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پر مبنی جرائم کا ایک تازہ ترین واقعہ پیش آیا جس میں ایک دہشت گرد نے بتیس سالہ عراقی خاتون پانچ بچوں کی ماں شیما الاوادی کو سر میں شدید ضربات پہنچا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جبکہ خاتون کا شوہر بچوں کو سکول چھوڑنے گیا ہوا تھا۔ وہاں کی مسلمان آبادی میں اس واقع سے شدید اضطراب پایا جاتا ہے۔ نو گیارہ کے بعد امریکہ اور یورپ میں مسلمانوں کے خلاف Hate Crime کے بے شمار واقعات سامنے آئے ہیں اور ان سے زیادہ واقعات ایسے ہیں جو یا تو میڈیا پر رپورٹ نہیں ہوتے یا پھر دیگر وجوہات بتا کر انہیں دبا دیا جاتا ہے۔ مغربی معاشروں میں رہنے والے مسلمان سالہا سال سے اپنی محنت اور علم وفن سے ان معاشروں کو ترقی دینے میں مصروف ہیں، اچھے شہری ہیں اور حکومت اور قانون کے وفادار ہیں۔ اس کے باوجود وہ مذہب کی بنیاد پر نفرت اور تعصب کا نشانہ بن رہے ہیں۔ یہ صورتحال خود ان معاشروں کی اندرونی تباہی کو راہ دے رہی ہے۔ امریکی اور یورپی حکومتیں اپنے مذموم گلوبل سیاسی ایجنڈوں کی خاطر اپنے اپنے عوام کے آگے جس جھوٹے پراپیگنڈے میں مصروف ہیں۔ اس کے باعث ان کے اپنے عوام شدت پسند، دہشت گرد اور جنونی بن رہے ہیں اور یہ بات ایک طرف خود ان کی اپنی اندرونی سلامتی کے لیے نقصان دہ ہے، تو دوسری طرف مسلم دنیا میں ان کے خلاف نفرت کو مزید بڑھانے کا باعث ہے۔ گلوبل امن کے دعوے داروں نے اپنی ان دوغلی پالیسیوں پر غور نہ کیا تو آج کی بدلتی ہوئی دنیا میں انہیں جلد یا بدیر سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دعاؤں میں یاد رکھیے ۔

صائمہ اسما

قیامت کی گھڑی

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى. فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى.

ترجمہ: قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے میں اس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں تا کہ ہر متنفس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے، پس کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش نفس کا بندہ بن گیا تجھ کو اس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے ورنہ تو ہلاکت میں پڑ جائے گا (طہٰ ۱۵،۱۴)۔

انسانی اعمال کے اخلاقی نتائج بڑے دوررس اثرات پیدا کرتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس دنیاوی زندگی میں مکمل عدل کا قیام ممکن نہیں اس لئے عقل سلیم تقاضا کرتی ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ضروری ہے جس میں ہر انسان کو اس کے اعمال کے مطابق پوری پوری جزاء وسزا دی جا سکے۔ اللہ تعالیٰ قائم بالقسط ہے۔ اس سے یہ بات بعید از امکان ہے کہ وہ اپنے بندوں کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلہ نہ فرمائے۔ لہٰذا اس نے روزِ جزاء مقرر فرما دیا اور اپنے بندوں کو رسولوں اور کتابوں کے ذریعے اس کی خبر کر دی۔

قیامت کی تیاری

قیامت کسی طویل مدت میں واقع نہ ہوگی کہ اس کو آتے دیکھ کر انسان سنبھل سکے اور کچھ تیاری کر سکے وہ تو کسی روز اچانک چشم زدن میں یا اس سے بھی کم مدت میں آ جائے گی ارشادِ ربانی ہے: قیامت کے برپا ہونے کا معاملہ کچھ دیر نہ لے گا مگر بس اتنی کہ جس میں آدمی کی پلک جھپک جائے بلکہ اس سے بھی کچھ کم حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے (۱۶:۷۷) دوسری جگہ فرمایا: آنے والی گھڑی قریب آ لگی ہے، اللہ کے سوا کوئی اس کو ہٹانے والا نہیں (۵۳:۵۸)

اولادِ آدم کو یہ خیال ہرگز نہیں کرنا چاہیے کہ سوچنے کے لئے ابھی بہت وقت پڑا ہے کیا جلدی ہے کہ ان باتوں پر ہم سنجیدگی سے غور کریں اور انہیں ماننے کا بلا تاخیر فیصلہ کر ڈالیں۔ نہیں ہم میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ مہلت زندگی کتنی باقی ہے ہر وقت ہر شخص کی موت واقع ہو سکتی ہے اور قیامت بھی اچانک پیش آ سکتی لہٰذا جس کو بھی عاقبت کی فکر کرنی ہے وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر سنبھل جائے کیونکہ ہر سانس کے بعد یہ ممکن ہے کہ دوسرا سانس لینے کی نوبت نہ آئے۔

دنیا میں انسان مستقبل کی اہم ضروریات کے لئے پیسہ جمع کرتا ہے بچوں کی شادی کے لئے بہت پہلے سے تیاری کرتا رہتا ہے کہ ضرورت کے وقت تنگی نہ ہو یا کسی سے قرض نہ لینا پڑے۔ قیامت کا دن تو بڑی آفت اور زیادہ تلخ ساعت ہے وہاں نہ تو قرض لیا جا سکے گا اور نہ خریداری ہی ممکن ہو گی۔ ایسے اہم کٹھن وقت کے لئے جتنا انسان کے بس میں ہو تیاری کرتے رہنا انتہائی دانشمندی اور دور اندیشی کی بات ہے وہاں انسان سوچ سمجھ سے کام لے گا تو اسے زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور روز حشر کی عظیم آفتوں سے بھی محفوظ ہو جائے گا۔

قیامت کے وقت کو مخفی اس لئے رکھا گیا ہے کہ آزمائش کا مدعا پورا ہو سکے جسے آخرت کی کچھ فکر ہوا سے ہر وقت اس گھڑی کا کھٹکا لگا رہے اور یہ کھٹکا اسے بے راہروی سے بچاتا رہے اور جو دنیا میں گم رہنا چاہتا ہو وہ اس خیال میں مگن رہے کہ قیامت ابھی کہیں دور دور بھی آتی

نظر نہیں آتی۔

قیامت کے مناظر

قیامت کے روز آسمان بری طرح ڈگمگائے گا اور پھٹ جائے گا، پہاڑ اڑے اڑے پھریں گے، زمین ہلا ڈالی جائے گی، تارے بکھر جائیں گے، چاند بے نور ہو جائے گا، چاند اور سورج ملا کر ایک کر دیے جائیں گے، سمندر بھڑکا دیے جائیں گے، زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی وہ عظیم اور ہولناک منظر جن و انس سب دیکھ رہے ہونگے ملائکہ صف بستہ کھڑے ہونگے اعمالنامے کھولے جائیں گے اور کھلی کچہری میں ہر شخص کا امتحان لیا جائے گا ہر شخص اللہ کے سامنے یکہ وتنہا آئے گا عمل صالح کے علاوہ کوئی مونس و مددگار نہ ہوگا اور نہ کوئی سفارشی ہوگا ارشاد باری تعالی ہے:

اس روز ہر متنفس اپنے ہی بچاؤ کی فکر میں لگا ہوا ہوگا اور ہر ایک کو اس کے کئے کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا اور کسی پر ذرا برابر ظلم نہ ہونے پائے گا (۱۱۱:۱۴)

ظالموں کے لئے اس دن بڑی ہلاکت ہوگی، بہت بڑا خوفناک منظر ہوگا۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی اور دل اڑے جاتے ہونگے مجرم وہاں چہروں سے پہچان لئے جائیں گے اور انہیں پیشانی کے بال اور پاؤں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائے گا قیامت کے روز مجرم کہیں گے ''اے ہمارے رب ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے ہم تیری دعوت کو لبیک کہیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے'' مگر ان کی دعا اکارت ہی جانے والی ہے اہلِ ایمان معزز وفود کی شکل میں نہایت عزت واحترام کے ساتھ ہونگے اور مجرم پیاسے جانوروں کی طرح جہنم کی طرف ہانکے جا رہے ہونگے۔

بدترین ساتھی

دنیا میں لوگ کفر وفسق اور ظلم وعصیان پر بڑے اطمینان سے آپس میں تعاون کرتے رہتے ہیں اور یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان بڑی گہری محبت اور دوستی ہے ہم ایک دوسرے کے بڑے اچھے رفیق ہیں۔ روز قیامت جب انسان حقیقت دیکھ لے گا اور ہر طرح کے دھوکہ وفریب کا پول کھل جائے گا تو اسے پتا چلے گا کہ اپنے گمراہ دوستوں کی اطاعت مجھے کس ہولناک انجام تک لے آئی ہے وہاں یہ بات شدت سے محسوس ہوگی کہ جسے میں اپنا بہترین باپ بھائی، دوست، لیڈر یا مددگار سمجھ رہا تھا وہ دراصل میرا بدترین دشمن تھا۔ جو لوگ دنیا میں آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے چلتے ہیں یا اپنی کمزوری کو حجت بنا کر طاقتور ظالموں کی اطاعت کرتے ہیں انہیں جان لینا چاہیے کہ آج جو ہمارے دوست اور لیڈر بنے ہوئے ہیں کل ان میں سے کوئی بھی ہمیں خدا کے عذاب سے ذرہ برابر بھی نہ بچا سکے گا۔

دراصل کسی انسان میں یہ قوت نہیں کہ وہ دوسرے کے ضمیر اور روح کو خرید لے اللہ تعالی نے ہر انسان کو آزاد اور مکرم بنا کر اپنی بندگی واطاعت کی دعوت دی۔ انسان کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ بودا اور کمزور نہ بنے کسی کی مرضی کو اپنے اوپر مسلط نہ ہونے دے کوئی بڑے سے بڑا ڈکٹیٹر بھی ضمیر اور روح پر پابندی نہیں لگا سکتا۔ دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی قوت بھی صرف انسانی جان اور جسم کا تعلق ختم کر سکتی ہے، تشدد اور اذیت دے سکتی ہے عقل اور حیرت سے انسان خود دستبردار ہوا کرتا ہے اپنی آزادی کو معمولی مفادات کی خاطر بیچنا کردار کی کمزوری ہے آج جو لوگ اپنی شخصیت کو بھلا رہے ہیں کسی خوف، محبت اور مفاد کی خاطر اللہ کا راستہ چھوڑ رہے ہیں وہ آخرت میں المناک انجام سے دوچار ہونگے۔

آخرت میں جب حقیقت آنکھوں کے سامنے آجائے گی اور انسان دیکھ لے گا کہ گمراہ پیشواؤں کی اطاعت نے مجھے برباد کر دیا ہے تو وہ اپنے ان بزرگوں پر پلٹ پڑے گا اور چیخ چیخ کر کہے گا کہ تم ہی میری ہر مصیبت کے ذمہ دار ہو تم نہ ہوتے تو میں رسولوں کی بات مان لیتا۔ سب ایک دوسرے پر لعنت کریں گے، گالیاں دیں گے، ہر ایک چاہے گا کہ اپنے جرائم کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری دوسرے کے سر ڈال کر اسے سخت سے سخت سزا دلوائے پہلے جو یار تھے اور جن

کے وسوسوں پر یقین رکھا جاتا تھا آج نہایت تنگی، گھٹن اور انتقام کے جذبات سے مغلوب ہوکر ان کے لئے سخت بد عائیں ہونگی لیکن اس وقت لعن طعن اور حزع فزع سے کچھ حاصل نہ ہوگا، مصیبت ٹالے نہ ٹلے گی۔ لہٰذا آج ہی ہر شخص کو جان لینا چاہیے کہ میں جس کے پیچھے چل رہا ہوں یا جس کا حکم مان رہا ہوں وہ خود کہاں جا رہا ہے اور مجھے کہاں پہنچا کر چھوڑے گا۔

قیامت کا ہولناک منظر دیکھ کر انسان اپنے قریب ترین عزیزوں کو بھی بھول جائے گا اور ہر قیمت پر عذابِ الٰہی سے بچنا چاہے گا۔ ارشاد ربانی ہے: ''جس روز آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون جیسے ہو جائیں گے اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لئے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دیدے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے۔ ہرگز نہیں.....''

اے انسان! فرصتِ زندگی کو دراز سمجھ کر اور حال کے امن کو دائم خیال کر کے فکر آخرت کو آنے والے وقت پر نہ ٹال معلوم نہیں مہلت حیات خاتمے کے قریب ہو

(ماخوذ از تفہیم القرآن (سید ابوالاعلیٰ مودودی) فی ظلال القرآن (سید قطب شہید)

ڈاکٹر عبداللہ محسن

صحت ایک نعمت

صحت بلا شبہ اللہ کریم کی ایک نعمت ہے، اور بہت بڑی نعمت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یقیناً نوع انسانی کو صحت اور عافیت سے افضل کوئی شے عطا نہیں کی گئی ہے (سنن نسائی)۔ اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں اکثر لوگ دھوکے میں ہیں۔ ایک صحت دوسری فارغ البالی'' (صحیح بخاری)

اس نعمت کا جس قدر شکر بجالائیں، کم ہے۔ شکر کیا ہے؟ اس عطا کرنے والے کی حمد و ثنا بجا لانا، اس عظیم نعمت کو پہچاننا اور اس کا اعتراف و اقرار کرنا۔ اس زبانی اعتراف اور کلمہ شکر ''الحمد للہ'' ادا کرنے کے ساتھ شکر کا اصل مقام یہ ہے کہ ہم اس عظیم نعمت، صحت کا صحیح اور بجا استعمال کریں۔ اس کی ناقدری اور ناشکری نہ کریں۔ اس کا وعدہ ہے ''اگر تم شکر بجالاؤ گے تو میں ضرور تمہیں اور زیادہ دوں گا'' (سورۃ ابراہیم ۱۴۔۷)

لیکن ہم ایسے ناشکرے اور ناقدرے واقع ہوئے ہیں کہ ہم سے زبانی کلمہ شکر الحمد للہ بھی ادا نہیں ہوتا۔ الا ماشاء اللہ

اکثر ہمیں نعمت کی قدر اس کے چھن جانے کے بعد ہوتی ہے، صحت کی قدر و قیمت بیماری میں محسوس ہوتی ہے۔ اسے بھی غنیمت سمجھنا چاہئے۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ بزرگوں نے دکھ، درد اور بیماری کو بھی اپنے خالق و مالک کی عطا سمجھا ہے۔ چنانچہ وہ اکثر صحت و عافیت کی دعا ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''اے اللہ! بیماری کی نعمت کو صحت کی نعمت سے بدل دیجئے!''

بیماری کے متعلق دنیا میں عجیب و غریب خیالات موجود رہے ہیں۔ آج بھی ناسمجھی یا دوسروں کے زیر اثر بعض لوگوں کی زبان سے غلط فقرے نکل جاتے ہیں۔ ان سے باز رہنا از بس ضروری ہے۔ انسانی ذہن کی پریشانی کا اثر انسانی جسم پر پڑتا ہے اور بہت سی بیماریوں کی وجہ محض انسان کا پریشان ہونا ہے۔

بیماری ایک جسمانی عارضہ ہے۔ اس کے علل و اسباب بھی مادی ہوتے ہیں۔ وہ اعضاء میں خرابی پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہوں یا جسم کے نظام میں گڑبڑ واقع ہو جانے کے سبب ہوں۔ ان کے علاوہ اور کتنی وجوہات ہیں جو بیماری کا سبب ہوتی ہیں۔ کبھی لوگوں نے بیماری کو جن بھوت اور بدروحوں کا اثر قرار دیا۔ چنانچہ توہم پرست لوگوں نے علاج معالجے کے بجائے جھاڑ پھونک کی صورت میں بیماروں کے ساتھ نہایت تکلیف دہ سلوک کئے، جن کے ذکر سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جہالت اور بے خبری میں مبتلا لوگوں میں اب تک یہ صورت حال موجود ہے۔

بیماری رحمت ہے!

بیماری اکثر ہماری بے احتیاطی کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن اللہ پاک کی طرف سے خیر و برکت اور رحمت کا ذریعہ ہو جاتی ہے۔ بیماری انسان کے گناہوں کا کفارہ اور فلاح و کامرانی کا سبب بن جاتی ہے، بشرطیکہ وہ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور شفا کے لئے اللہ کریم سے لو لگائے رکھے۔ چنانچہ مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت رسول ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ جس شخص کو بھلائی پہنچانا چاہتا ہے، اسے تکلیف سے دوچار کرتا ہے'' (موطا)

یہ محض ایک فرضی بات نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ بیماری میں سرکش سے سرکش انسان ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ وہ کتنا ہی

سخت دل کیوں نہ ہو، بیماری اس کے اندر سوز و گداز پیدا کر دیتی ہے اس حال میں بڑے بڑوں کی زبان پر اللہ کا نام آجاتا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں حضرت رسول امین ﷺ فرماتے ہیں:

''جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دو فرشتے بھیجتا ہے اور فرماتا ہے دیکھو! وہ اپنے عیادت کرنے والوں سے کیا گفتگو کرتا ہے۔ اگر ان کے آنے پر اللہ جل شانہ کی حمد و ثنا کر رہا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے پاس یہ اطلاع لے جاتے ہیں جب کہ وہ خود بھی جانتا ہے۔ اس پر وہ اعلان فرماتا ہے:

''اگر میں اسے موت سے ہم کنار کروں گا تو اسے جنت میں داخل کروں گا اور اگر اسے شفا بخشوں گا تو اس کا (خراب) گوشت اچھے گوشت سے اور اس کا (گندا) خون اچھے خون سے بدل دوں گا۔ اور اس کے گناہ بھی اس سے دور کر دوں گا'' (موطا امام مالک، روایت عطا بن یسارؒ)

گویا بیماری ایک صابر و شاکر مومن کے جسم و جان کی بھلائی اور مغفرت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

بیماری میں آسانی اور رعایت

اسلام کی بیماروں کے ساتھ پہلی ہمدردی تو یہ ہے کہ بہت سے فرائض کے ادا کرنے میں رعایت دیتا ہے۔ کئی عبادتوں کو ایک قلم معاف یا کم کر دیتا ہے یہ فرماتے ہوئے کہ:

اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔'' (نور۔۶۱)

نماز جیسے بنیادی اور اہم ترین فریضہ میں ان کے لئے سہولتوں کا اہتمام فرمایا گیا۔ چنانچہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر اور بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر نماز پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی۔

پھر بیماروں کے لئے وضو کی معافی کا خصوصی حکم جاری فرمایا گیا اور انہیں تیمّم کی سہولت عنایت فرمائی گئی۔

ترجمہ: اگر تم بیمار ہو تو تیمّم کر لو۔'' (النساء۔۴۳)

مرض میں مبتلا ہونے کی صورت میں انہیں روزہ توڑنے اور قضا رکھنے کی اجازت دی گئی۔ مزید برآں حج کے احکامات میں بھی بیمار کے لئے رعایت فرمائی گئی۔

جہاد جیسے اہم ترین معاملہ میں شرکت کے فرض سے اسے بری قرار دیا گیا۔ ارشاد رب کریم ہے:

ترجمہ: ''نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد میں شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر۔'' (فتح۔۱۷)

ترجمہ: ''نہ کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر (جہاد کی عدم شرکت کی باز پرس ہے)۔'' (توبہ۔۹۱)

بڑی بات تو یہ ہے کہ حالت مرض میں ان رخصتوں پر عمل کرنے سے اجر میں ذرّہ برابر کمی کا اندیشہ نہیں بلکہ رخصتوں پر عمل کرنے سے جس بے چارگی و خستگی کا اظہار ہوتا ہے وہ عین مطلوب ہے۔ مریض رب کریم کی رحمتوں اور عنایتوں کا سزاوار قرار پاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (بروایت حضرت عبد اللہ بن عمرؓ) ''بے شک جب بندہ عبادت کی نیک راہ پر ہوتا ہے، پھر بیمار پڑ جاتا ہے تو اس فرشتے سے کہا جاتا ہے جو اس کے اعمال لکھنے پر مقرر ہے کہ اس کا وہی عمل لکھ جو وہ تندرستی کی حالت میں کرتا تھا، یہاں تک کہ میں اس کو صحت یاب کروں یا اپنی طرف بلا لوں۔''

سبحان اللہ! قربان جایئے اس انداز محبت و کرم پر..... بے شک یہ کرم اسی کو سجتا ہے جو سب سے بڑھ کر کریم ہے۔

بیماری سزا نہیں!

مسلمان فتنہ اور آزمائش سے پناہ طلب کرتا ہے اور اسے ایسا ہی کرنا چاہئے۔ بیماری بھی ایک آزمائش ہے لیکن اگر بیماری آجائے تو وہ مومن کے مراتب میں اضافہ کا ذریعہ بنتی ہے۔ اسے سزا کیسے کہا جا سکتا ہے؟

کون نہیں جانتا کہ ہر ترقی کے لئے انسان کو امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ بچہ بچہ اس حقیقت سے باخبر ہے کہ ہر دوسرے درجہ میں چڑھنے کے لئے اسے امتحان دینا ہوتا ہے۔ اور شوق سے اس امتحان کی تیاری کی جاتی ہے۔ کوئی بھی ایسے امتحان کو وبال اور سزا نہیں

سمجھتا۔ اس لئے کہ کوئی کامیابی اور ترقی آزمائش و امتحان کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کے آخری کلام میں اس مضمون کی متعدد آیات موجود ہیں۔ چند آیات ملاحظہ فرمائیے:

ترجمہ: ''اور ہم تمہیں سختی میں اور آسودگی میں آزمائش کے طور مبتلا کرتے ہیں۔'' (الانبیاء ۲۱:۳۵)

ترجمہ: ''تمہارے مال اور جان میں ضرور تمہاری آزمائش کی جائے گی'' (آل عمران ۳:۱۸۶)

قرآن مجید کی یہ آیت خاص طور پر قابلِ توجہ ہے جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

ترجمہ: ''اور ہم کسی قدر خوف، بھوک مال و جان اور پھلوں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے۔ تو صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیں۔'' (البقرہ ۲:۱۵۵)

گویا آزمائش میں جان کا نقصان بھی شامل ہے جس کی ایک صورت دکھ درد اور بیماری بھی ہوسکتی ہے۔ مبارک ہیں وہ بندے جو بیماری پر شکوہ شکایت کرنے کے بجائے صبر سے کام لیتے ہیں اور اپنے دکھ درد کو اللہ کریم کی طرف مزید توجہ کا ذریعہ بناتے ہیں۔

جتنا بڑا درجہ اتنا بڑا امتحان

یہ حقیقت ہر دم پیش نظر رکھنی چاہئے کہ دکھ درد کی زیادتی گناہوں کی معافی کا ذریعہ اور درجات کی بلندی کا سبب ہوتی ہے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جتنا بڑا درجہ ہوتا ہے اتنا ہی بڑا اور سخت امتحان ہوتا ہے۔ اور انہیں اسی قدر محنت سے کام کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا نیک بندوں کو دکھ درد میں مبتلا دیکھ کر غلط تاثر نہ لینا چاہئے۔

ہمارے بزرگ اور صوفیائے کرام بیماری کو رحمتِ الٰہی کا ایک ذریعہ اور مدارج کمال کا ایک زینہ قرار دیتے ہیں۔ اور جو کسی دکھ درد سے دوچار نہ ہوا سے سعادت سے محروم سمجھتے ہیں۔ تصوف کی کتابوں میں اکثر ایسے واقعات ملتے ہیں کہ اگر مرید کبھی بیمار نہ ہوا تو مرشد نے اس کی ترقی و کمالات میں شک کیا۔

امام بخاریؒ نے حضرت انس بن مالکؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے سنا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں اپنے کسی بندہ کو دو پیاری چیزوں کی تکلیف دیتا ہوں اور وہ صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، ان کے عوض اسے جنت عطا کرتا ہوں۔ اور یہ پیاری چیزیں اس کی دو آنکھیں ہیں۔'' (بخاری۔ باب المرض)

اسی پر دوسری بیماریوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

بیماری پر صبر، جنت کا وعدہ

اگر اس کے بعد بھی کوئی شخص بیماری کو عذاب یا سزا سمجھتا ہے تو اسے مخبر صادق ﷺ کی اس حدیث پر غور کرنا چاہئے اور اپنے خیالات کو بدلنا چاہئے۔

حضرت عطاء بن رباحؒ روایت کرتے ہیں، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مجھ سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ میں تمہیں ایک جنتی خاتون نہ دکھادوں؟

میں نے عرض کیا کیوں نہیں، ضرور دکھایئے۔

انہوں نے فرمایا: اس کالے رنگ والی عورت کو دیکھ لو۔ یہ عورت ایک دن حضرت رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی مجھے مرگی کا دورہ پڑتا ہے اور بسا اوقات میرا ستر کھل جاتا ہے پس رب کریم سے میری صحت کے لئے دعا فرمائیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اگر تم چاہو تو صبر کرو تمہیں جنت ملے گی۔ اور چاہو تو میں اللہ تعالیٰ کے حضور تمہاری صحت کے لئے دعا کئے دیتا ہوں۔''

اس عورت نے عرض کیا حضورؐ میں صبر کروں گی۔ بس آپؐ مولا کریم سے یہ دعا فرما دیجئے کہ میری بے پردگی نہ ہو، چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے اس کے لئے یہ دعا فرمائی (صحیح بخاری و مسلم)

صدقہ اور دعا نازل شدہ بیماری اور آئندہ آنے والی مصیبت

سے بچا لیتا ہے ۔ والدین کی نیکی سے اولاد بھی مصیبتوں سے بچالی جاتی ہے۔ آپ خضر علیہ السلام کا واقعہ تو جانتے ہی ہیں۔ ڈاکٹروں سے درخواست ہے کہ وہ مریضوں کو صدقے کی تلقین کریں اور ان کو نماز اور دعا کی ترغیب دیں۔

بیماری، گناہوں کا کفارہ

رہا بیماری اور گناہ کا تعلق، اس بارے میں خوب ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ بیماری عذاب نہیں بلکہ گناہوں کا کفارہ ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں ہم حضور اکرم ﷺ کے چند ارشادات نقل کرتے ہیں۔

۱) حضرت محمد ﷺ نے فرمایا:

بے شک اللہ تعالیٰ مومن کی تمام خطائیں ایک رات کے بخار سے دور کر دیتا ہے۔ (الترغیب والترہیب)

۲) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے بخار کا ذکر ہوا، اس پر ایک شخص نے بخار کو برا بھلا کہا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''بخار کو بُرا بھلا نہ کہو، کہ یہ گناہوں کو یوں صاف کر دیتا ہے جیسے آگ لوہے کے زنگ اور میل کو صاف کر دیتی ہے۔'' (سنن ابن ماجہ)

۳) حضرت ام العلا رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت رسول اللہ ﷺ میری عیادت کو تشریف لائے، اور فرمایا۔'' ام العلا! تمہیں خوش خبری ہو۔ مسلمان کی بیماری اس کے گناہ کو یوں دور کر دیتی ہے جیسے آگ سونے چاندی کا کھوٹ دور کر دیتی ہے۔'' (سنن ابوداؤد)

۴) حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضرت نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''مومن کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی، یہاں تک کہ کوئی کانٹا بھی نہیں چبھتا لیکن اس کے ذریعہ اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں یا اس کی خطائیں دور کر دی جاتی ہیں۔'' (موطا)

۵) حضرت یحییٰ بن سعیدؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص فوت ہوا تو کسی نے اس موقع پر کہا ''کیسی اچھی موت پائی، بیمار نہ پڑا اور جاں بحق ہوگیا۔'' اس بات پر آپ ﷺ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''تم پر افسوس! تمہیں کیا معلوم اگر اللہ پاک کسی بندے کو کسی مرض میں مبتلا فرماتے ہیں تو مرض کو گناہوں کا کفارہ بنا دیتے ہیں۔'' (موطا امام مالک۔ کتاب الجامع)

بلا شبہ بیماری ایک تکلیف ہوتی ہے لیکن اس کی تکلیف کی شدت، اور اس کا احساس اس بات سے دور ہو جاتا ہے کہ یہ کتنی ہی دوسری برائیوں کو دور کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

۶) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں: ''نہیں ہوتا کسی مسلمان کو کوئی درد یا تکان، کوئی بیماری یا کوئی غم یا کوئی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف، مگر اس سے اس کی برائیاں دور ہو جاتی ہیں۔'' (صحیح بخاری و مسلم)

۷) اس مضمون کی احادیث تو بہت ہیں ہم صرف حضرت ابو نعیمؒ کی ایک مختصر روایت نقل کر کے اس عنوان کو ختم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''جو کچھ اچھا برا ہو گیا تھا بیماریاں اس کا کفارہ بن جاتی ہیں۔'' (صحیح بخاری)

اگر کسی ذہن میں یہ سوال آئے کہ امراض گناہوں کا ازالہ کیسے کر سکتے ہیں؟ تو اسے یاد رکھنا چاہئے کہ آگ کی بھٹی لوہے کا زنگ دور کر دیتی ہے اور سنار کی کٹھالی چاندی سونے کا میل کچیل صاف کر دیتی ہے۔ یہی حال بیماری کی شدت کا ہے۔ بیماری میں انسان کا ذہن وہ چاہے نہ چاہے، اللہ پاک کی طرف جاتا ہے۔ بے ساختہ اس کی زبان پر بار بار اللہ اللہ آتا ہے۔ سارا ماضی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ گناہوں پر ندامت ہوتی ہے اور انسان آئندہ کے لئے نیک عزائم کے ساتھ بیماری کے بستر سے اٹھتا ہے۔ مولا کریم کو اپنے بندہ کی یہ ادا سب سے زیادہ محبوب ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہماری بیماریاں ہمارے گناہوں کا کفارہ اور مستقبل کے لئے نیک ارادوں کا ذریعہ بن جائیں۔

دکھ درد اتفاقی حادثہ نہیں!

یہ سوچنا درست نہ ہوگا کہ دکھ درد اور بیماریاں محض اتفاقات اور حادثہ کی باتیں ہیں۔ نہیں، ہر بات حکم الٰہی سے ہے، اور ہر معاملہ اس کی تدبیر اور حکمت بالغہ کا حصہ ہے۔ اس بارے میں کلام اللہ کی واضح آیات آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اس لئے کہ درست عمل کے لئے سوچ کا درست ہونا ضروری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

ترجمہ: ''اور ہم نے ہر بات کو لکھ کر محفوظ کر رکھا ہے۔'' (النباء ۲۹)

ترجمہ: ''ہر چھوٹی بڑی بات تحریر شدہ ہے۔'' (القمر۔۵۳)

ترجمہ: ''کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا، موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔'' (آل عمران ۱۴۵)

ترجمہ: ''کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب (یعنی نوشتۂ تقدیر) میں لکھ نہ رکھا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لئے بہت آسان کام ہے۔'' (الحدید۔۲۲)

مختصر یہ کہ کائنات میں کوئی امر محض حادثاتی اور اتفاقی نہیں، بلکہ ہر عمل اللہ کی مرضی سے ہے اور حکمت پر مبنی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ارض وسماء کے خالق کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی ہو۔ ہماری محدود عقل حکمت نہ سمجھ سکے تو دوسری بات ہے۔ ہمیں ہمیشہ بھلائی کی امید رکھنی چاہئے اور ہر دم اس سے خیر کی دعا کرنی چاہیے۔

جسے دُکھ نہیں

ہماری کم ہمتی اور سہل پسندی کا یہ حال ہے کہ ذرا دکھ درد ہوا اور گھبرا اُٹھے۔ بعض لوگ تو ذرا سی بیماری میں آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ حالانکہ بیماری جسم کی زکوٰۃ ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ صحت کی قدر ہی بیماری سے ہوتی ہے۔ جو بیمار نہ ہوا، اسے عافیت کی قدر کیسے ہو سکتی ہے۔

حضرت عامر بن لعوام بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ کی ایک مجلس میں) فرمایا: ''کسی صاحب ایمان کو دکھ درد ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اسے شفاء عطا فرما دیتا ہے تو وہ دکھ درد اس کے گزشتہ گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔'' (ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ ''مسلمان مرد اور مسلمان عورت کو ہمیشہ اس کی ذات اور اس کے مال و اولاد میں مصیبت و بلا پہنچتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ خدا سے جا ملتا ہے گناہوں سے پاک وصاف۔'' (ترمذی)

بیماری کو برا نہ کہو!

بیماری کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر آپ معلوم کر چکے ہیں۔ بلاشبہ بیماری کیسی بھی ہو تھوڑی ہو یا زیادہ تکلیف کا موجب ہوتی ہے۔ بسا اوقات اس سے معمولات میں فرق آجاتا ہے، کئی کام رُک جاتے ہیں، عبادات میں فرق آجاتا ہے لیکن اس سے اجر وثواب میں فرق نہیں آتا بلکہ بیماری گناہوں کا کفارہ اور اجر وثواب کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ہمارے نبیؐ نے اسے نیکیوں کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

ایک نیک دل اور پاک باز مسلمان کے لئے یہ امر کسی طرح مستحسن نہیں کہ وہ بیماری کو بُرا کہے۔ اس سلسلہ میں حضرت رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کا یہ واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ ام سائبؓ یا ام حسیبؓ کے ہاں تشریف لے گئے اور ان سے دریافت کیا تم کانپ رہی ہو تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ وہ بولیں:

''بخار چڑھا ہوا ہے اللہ اس کا بھلا نہ کرے۔'' حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''بخار کو بُرا نہ کہو کیونکہ یہ اولاد آدم کی خطائیں دور کرتا ہے، جیسے گرم بھٹی لوہے کا زنگ اور میل صاف کر دیتی ہے۔'' (صحیح مسلم)

☆☆☆☆

فریدہ خالد

شہد کی مکھی

ہمیں کیا سکھاتی ہے؟

عربی میں شہد کی مکھی کو نحل کہتے ہیں۔قرآن مجید میں ایک پوری سورت اس کے نام سے موسوم ہے۔سورہ النحل کو پڑھتے ہوئے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی بہت سی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔انہی میں سے ایک نعمت شہد ہے جسے لوگوں کے لیے ''شفاء للناس'' کہا گیا ہے۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو آخر اتنی اہمیت کیوں دی کہ اس کے نام پر ایک پوری سورت قرآن مجید میں نازل کی اور اس کے ساتھ ہی انسان کو غور وفکر کی دعوت دی؟ آخر رب تعالیٰ اس چھوٹی سی مکھی سے ہمیں کیا سکھانا چاہتا ہے؟ آیئے کچھ غور وفکر ہم بھی کریں مل کر۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں تو گھر بنا اور درختوں میں اور ان (چھپروں) میں جن پر لوگ بیلیں چڑھاتے ہیں۔پھر ہر قسم کے پھلوں (اور پھولوں) سے رس چوس، پھر اپنے رب کی ہموار راہوں پر چل، ان کے پیٹوں سے مختلف رنگوں کا مشروب (شہد) نکلتا ہے۔اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ بے شک اس میں بھی ایک نشانی ہے۔ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں'' (النحل16:68-69)

آیئے اس آیت کی روشنی میں شہد کی مکھی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر دوڑائیں اور ان آیات پر غور وفکر کر کے ان اسباق کو جاننے کی کوشش کریں جو اللہ تعالیٰ ہم کو سکھانا چاہتا ہے۔

شہد کا چھتہ ایک مکمل ریاست ہے

شہد کی مکھیاں تین اقسام کی ہوتی ہیں۔سب سے پہلے ذکر کرتے ہیں ''ملکہ مکھی'' کا یعنی Bee Queen جو تمام مکھیوں کی سردار ہوتی ہے۔باقی تمام مکھیاں اسی کی تابع اور فرمان برادر ہوتی ہیں اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتی ہیں۔اس کی عمر سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی 2 سال سے اڑھائی سال تک۔اس کا کام اپنی ریاست کو صحیح طریقے پر چلانا اور بچے پیدا کرنا ہے۔

دوسری قسم نر مکھی یا Drone bee کی ہوتی ہے جو کہ تعداد میں بہت کم ہوتی ہیں۔ان کا واحد کام ملکہ مکھی سے جفتی کرنا ہے۔یہ اپنی حفاظت اور خوراک کیلئے مزدور مکھی کی محتاج ہوتی ہیں۔تیسری قسم ہے مزدور یا کارکن مکھی، ان کی تعداد 60 ہزار سے 80 ہزار تک ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ بہت سے کام سرانجام دیتی ہے۔ مثلاً چھتہ (گھر) بنانا، رس جمع کرنا، رس سے شہد بنانا، شہد کی اور چھتے کی حفاظت کرنا اور نئی پیدا شدہ مکھیوں کی حفاظت اور ان کی خوراک کا انتظام کرنا، ان کی عمر 28 سے 35 دن تک ہوتی ہے۔اور یہ اپنی چند روزہ زندگی میں مسلسل کام کرتی رہتی ہے۔

چھتے کی تیاری

جیسا کہ رب نے اسے حکم دیا کہ پہاڑوں، درختوں، چھتوں پر چڑھتی بیلوں میں اپنا گھر بنا یہ بالکل اسی طرح حکم کی تعمیل میں جتی ہوئی ہے۔شہد کی مکھی کا چھتہ اور اس کی تعمیر قدرت کا ایک شاہکار ہے۔جس پر انسانی عقل حیران ہے۔چھتے کی تیاری میں 80 ہزار تک مزدور مکھیاں مل جل کر انتہائی نظم وضبط کے ساتھ کام کرتی ہیں اور اس چھتے میں رہتی ہیں۔شہد کی مکھی اپنے لعاب (موم) سے یہ چھتہ بناتی ہے۔چھتے کی تیاری کے وقت ایک خاص قسم کے درجہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ موم کو نرم اور لچکدار رکھا جا سکے اور اپنی مرضی کی شکل میں ڈھالا جا سکے یہ درجہ حرارت ان مکھیوں کے اکٹھا ہونے پر پیدا ہوتا ہے اور قائم رہتا ہے۔اس کے علاوہ وہ اکٹھا کام کرتے ہوئے اس بات کا اندازہ

لگا لیتی ہیں کہ وہ مختلف خانوں کو دونوں اطراف سے 13 ڈگری بلند کر کے انہیں زمین کے متوازی ہونے سے روک لیتی ہیں جس کی وجہ سے شہد چھتے کے خانوں سے باہر نکل کر بہتا نہیں ہے۔

چھتہ بنانے کیلئے شہد کی مکھی مسدس یعنی چھ ضلعی شکل کا انتخاب کرتی ہے جو کہ ایک بہتر انتخاب ہے۔اس شکل کے بارے میں ریاضی دان بتاتے ہیں کہ ''چھ ضلعی ڈھانچہ ایک ایسی موزوں ترین جیومیٹرائی شکل ہے جس میں ایک اکائی کا زیادہ سے زیادہ علاقہ استعمال ہوسکتا ہے۔'' اس مسدس شکل کے تمام ضلعے مساوی لمبائی کے ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہوتے ہیں لہٰذا ان کی دیواریں مشترک ہوتی ہیں۔اس لیے ان میں موم کی مقدار کم استعمال ہوتی ہے۔یہ زیادہ مضبوط ہوتی ہیں اور ان کے درمیان جگہ نہیں بچتی۔لہٰذا یہ کم جگہ میں زیادہ خانے بنا سکتی ہیں۔اس شکل کے خانوں کے اندر بھی جگہ سب سے زیادہ ہوتی ہے۔اس لیے یہ زیادہ شہد ذخیرہ کر سکتی ہیں۔ شہد کی مکھی اپنے چھتے کی تیاری اتنے پرفیکٹ طریقے پر کیسے کر لیتی ہے۔ کیا یہ اس مکھی کا کمال ہے؟ حالانکہ انسان کو اس قسم کی تعمیر کے لیے بہت سی پیمائش کرنی پڑتی ہے۔ یہ دراصل وہ وحی ہے جو اسے اس کے رب کی طرف سے ملی اور اس مکھی نے اس حکم پر بلا چون و چرا عمل کیا۔نہ تو اس نے اس حکم میں اپنی مرضی شامل کی اور نہ ہی اسے بدلنے کی کوشش کی۔

شہد بنانے کیلئے رس جمع کرنا

اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔''پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوس'' ہزاروں مکھیاں اس حکم پر صبح سویرے سورج کی روشنی کے ساتھ اپنے چھتوں سے نکلتی ہیں اور اندھیرا ہونے تک واپس آتی ہیں..... یہ مکھی پھلوں اور پھولوں سے رس چوسنے کے لئے ڈالی ڈالی منڈلاتی ہیں۔ جب ایک مکھی کو کسی علاقے میں ایسے پھلوں کا ذخیرہ ملتا ہے جس میں مفید رس ہوتا ہے تو وہ واپس آ کر چھتے میں موجود اپنی ساتھیوں کو اس کی اطلاع دیتی ہے۔وہ یہ اطلاع کیسے دیتی ہے؟ ایک مخصوص قسم کے ناچ کے ذریعے.....اس ناچ کو ''مکھی کا ناچ'' یا Bee dance کہتے ہیں۔ اس ناچ کے بارے میں سب سے پہلے وان فرش (Von Frisch) نے انکشاف کیا۔اس کو ''شہد کی مکھیوں کے رویے اور ان کے نظام ابلاغ کے متعلق تحقیق پر 1973ء میں نوبل انعام ملا۔'' اس ناچ میں وہ اپنے مخصوص زاویوں میں ناچ کر اپنے ساتھیوں کو اس ذخیرے کی صحیح سمت، فاصلہ اور محل وقوع بتاتی ہے۔جس سے اس کی ساتھیوں کے لیے اس ذخیرے تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

پھول سے رس چوس لینے کے بعد مکھی اس پر ایک خاص قسم کا عطر کا ایک قطرہ گرا لیتی ہے.....لہٰذا بعد میں آنے والی مکھی جب اس پھول کا رس چوسنے کیلئے آتی ہے تو عطر کی خوشبو سونگھتے ہی فوراً اس پھول کو چھوڑ دیتی ہے اور آگے بڑھ جاتی ہے۔اس طرح اس کا وقت اور محنت ضائع ہونے سے بچ جاتے ہیں۔

جب مکھیاں رس چوس کر واپس آتی ہیں تو ان کا باقاعدہ سکیورٹی چیک ہوتا ہے۔نگران مکھیاں صرف انہی مکھیوں کو اندر جانے دیتی ہیں جو مفید رس لے کر آتی ہیں۔لیکن اگر کوئی مکھی کسی زہر آلود پھول کا رس چوس لیتی ہے، یا کسی ایسے پھل کا رس جس پر زہر آلود دوا کا سپرے کیا گیا ہو تو اس مکھی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ اسے اسی وقت مار کر گرا دیا جاتا ہے۔اگر نگران مکھیاں اس دیانت داری سے اپنا کام نہ کریں، جان پہچان یا دوستی کی بنا پر اس کو چھوڑ دیں تو شہد میں زہریلے مادے شامل ہو جائیں.....نگران مکھیاں ایسی بددیانتی کیسے کر سکتی ہیں، کیونکہ ان کے مالک نے تو اس شہد کو ''شفاء للناس'' کہا ہے۔ کیا ہم بھی اپنے مالک کے احکامات ماننے میں اتنے ہی دیانت دار ہیں یا ہمارے فرائض کی بجا آوری میں ہمارے اہل خانہ، رشتہ دار اور دوست احباب خلل ڈالتے ہیں.....؟

رس چوسنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو ٹیوب نما زبان دی ہے جس کی وجہ سے یہ باآسانی پھولوں کے اندر سے رس چوس لیتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بصارت بھی حیرت انگیز ہوتی ہے۔اس کی ہر آنکھ میں چھ ہزار عدسے موجود ہوتے ہیں۔ جو اس کو پھولوں کی پنکھڑی کے اندر موجود چھوٹے چھوٹے دانے، گرد و غبار کے ذرات تک دیکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے رس میں نقصان دہ ذرات شامل نہیں ہو سکتے۔اس کے علاوہ یہ شہد کو چھتے میں بھی گرد و غبار، دھوئیں اور کیڑے

مکوڑوں سے بچاتی ہیں۔اسی وجہ سے تیار شدہ شہد خالص ہوتا ہے۔

جمع شدہ شہد کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ہوا کی آمد و رفت مناسب ہو اور دوسرا اس کا درجہ حرارت 93 ڈگری فارن ہائیٹ سے کم یا زیادہ نہ ہو۔ لہٰذا یہ اپنے پیروں کو پھڑ پھڑاتی ہیں اور چھتے کے اندر کا درجہ حرارت مناسب رکھتی ہیں..... کیا ہم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تمام تر صلاحیتوں کو اسی طرح اور اسی مقصد کے تحت استعمال کرتے ہیں.....جیسا کہ ان کا حق ہے.....؟

شہد بنانا

جب کارکن مکھیاں رس چوس لیتی ہیں تو وہ اپنے منہ میں اس میں اپنا لعاب شامل کرتی ہیں۔ یہ رس ابتدا میں 50 سے 80 فیصد تک پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ چھتے میں لے جا کر اسے گاڑھا کیا جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس کا پانی سوکھتا جاتا ہے۔ اور جب شہد تیار ہو جاتا ہے تو اس میں پانی کی مقدار 16 سے 18 فیصد کے درمیان ہوتی ہے۔

شہد کی مکھی جو شہد تیار کرتی ہے وہ اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہوتا ہے اور یہ شہد ہی دراصل انسان حاصل کر پاتا ہے۔ اگر مکھی شہد صرف اپنی ضرورت کے تحت بنائے اور روزانہ اس کو ختم کر دے تو اس کو اس قدر محنت نہ کرنی پڑے گی بلکہ وہ ایک آرام دہ زندگی گزار سکتی ہے مگر انسان ضرور شہد سے محروم ہو جائے گا۔ دوسری طرف انسان شہد حاصل کرنے کیلئے مکھی کو اس کے گھر سے بے گھر کر دیتا ہے۔ اب اگر یہ اپنے ساتھ جاتے جاتے تھوڑا سا شہد لے جائے تو انسان کے لیے کچھ بھی نہ بچے۔ مگر وہ انسان کے ساتھ خیر خواہی اور احسان کا معاملہ کرتی ہے۔ اپنے ہی گھر سے بے دخل کر دینے والے انسان کو جاتے ہوئے شہد کا تحفہ دے جاتی ہے..... کیا ہم ان لوگوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کر سکتے ہیں جن کے رویے ہمیں بہت زیادہ تکلیف دیتے ہیں؟

شہد کی مکھی کے مزید فوائد

شہد بنانے کے علاوہ یہ مکھی زراعت کیلئے Pollination کا کام بھی بخوبی انجام دیتی ہے۔ جب رس چوسنے کے لیے یہ کسی پھول پر بیٹھتی ہے تو نر پھولوں کے تولیدی دانے اس کے جسم کے ساتھ چپک جاتے ہیں اور جب یہ دوسرے پھول پر جاتی ہے تو پھول کے نسوانی حصے ان زردانوں کو جنہیں Pollen کہتے ہیں، اپنی جانب کھینچ کر باروری حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح یہ بہت سے پھلوں اور سبزیوں کی پیداوار کی ترویج میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جو زردانے بچ جاتے ہیں یہ ان کو اپنے ساتھ چھتے میں لے جاتی ہیں اور شہد میں شامل کر دیتی ہیں۔

شہد بطور شفا

قرآن نے 1400 سال پہلے شہد کو لوگوں کے لیے شفا کہا تھا۔ آج سائنس بھی اس حقیقت کو مان گئی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک اپنی کتاب ''قرآن اور جدید سائنس'' میں لکھتے ہیں کہ ''اب ہمیں معلوم ہے کہ شہد میں شفا ہے اور یہ ہلکا سا جراثیم کش بھی ہے۔'' (ص نمبر 63)

اسی حوالے سے وہ ان روسی فوجیوں کا ذکر کرتے ہیں جو جنگ عظیم دوم میں زخمی ہوئے اور اپنے زخموں پر شہد لگایا جس سے ان کے زخموں میں بیکٹیریا کی افزائش رکی اس لیے ان کے زخم ٹھیک ہو گئے۔

شہد کی مکھی کے پیٹ میں مختلف رطوبتیں یا Enzymes بھی نکلتے ہیں۔ ان کو شاہی جیلی یا Royal Jelly کہتے ہیں۔ یہ جیلی شہد سے الگ کر لی جاتی ہے۔ یہ ایک قوت بخش مادہ ہوتا ہے اور آج اس کو مختلف امراض میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چین میں ستمبر 1993ء میں ہونے والی ایک کانفرنس میں امریکی سائنسدانوں نے اعتراف کیا کہ ''شہد، رائل جیلی، زردانہ (Pollen) اور شہد کی مکھی کی رال بہت سی بیماریوں کا علاج ہیں۔'' اسی طرح رومانیہ میں ایک ماہر امراض چشم نے بتایا کہ اس نے اپنے 2094 مریضوں پر شہد کو آزمایا جو موتیا بند کے مریض تھے۔ ان میں سے 2002ء مریض تندرست ہو گئے۔ اسی طرح کی بہت سی مثالیں بھی آج اس بات کی گواہ ہیں کہ شہد لوگوں کے لیے شفا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک مشہور حدیث کا ذکر بھی کرتی چلوں..... ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص آپؐ کے پاس آ کر کہنے لگا۔ ''میرے بھائی کا پیٹ خراب ہے''..... آپؐ نے فرمایا۔ ''اس کو شہد پلاؤ'' وہ دوبارہ آ کر کہنے لگا..... ''یا رسول اللہؐ شہد پلانے سے تو اس کا پیٹ اور خراب ہو گیا،''..... آپؐ نے فرمایا۔ ''اللہ کا قول سچا اور

تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے..... جاؤ اسے پھر شہد پلاؤ''..... وہ تیسری بار آیا اور کہنے لگا.....''میں نے شہد پلایا لیکن تکلیف اور بڑھ گئی.....''آپؐ نے فرمایا''اللہ نے سچ کہا اور تیرے بھائی کے پیٹ نے جھوٹ کہا۔''اس پر اس نے پھر شہد پلایا تو وہ تندرست ہو گیا۔

ڈاکٹر خالد غزنوی اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔''یہ حدیث علم العلاج اور ماہیت مرض کے بارے میں ایک روشن راہ ہے..... کیونکہ اسہال کا سبب آنتوں میں سوزش ہے جو کہ جراثیمی زہر یعنی Toxin یا وائرس سے ہوسکتی ہے۔اگر ایسے مریض کی آنتوں میں حرکات کو فوری طور پر بند کر دیا جائے تو سوزش بدستور رہے گی یا جراثیمی زہر وہیں رہ جائے گا۔اس لیے علاج کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے آنتوں کو صاف کیا جائے پھر جراثیم مارے جائیں۔شہد میں صلاحیت تھی کہ وہ یہ دونوں کام کر سکتا تھا۔

شہد کے فوائد تو بے شمار ہیں اور شہد کی مکھی پر غور و فکر کر کے انسان بہت سے بھولے ہوئے اسباق یاد کر سکتا ہے..... لہٰذا ہمیں چاہیے کہ دوسروں (غیر مسلموں) کی طرح ہم بھی ان پر ریسرچ کریں، اللہ کے احکامات کی پیروی کریں اور سر تسلیم خم کریں صرف تب ہی ہم اپنی دنیا اور آخرت سنوار سکتے ہیں۔

حوالہ جات:

1۔ http://www.honey.com/kids/index.html

2۔ ہارون یحییٰ (مترجم: ڈاکٹر تصدق حسین راجہ، جولائی 2001ء) اللہ کی نشانیاں عقل والوں کیلئے۔اسلامک ریسرچ سنٹر لاہور

3۔ ڈاکٹر ذاکر عبدالکریم نائیک: (1428ھ) قرآن اور جدید سائنس، دارالسلام: صفحہ نمبر 60 اور 63۔

4۔ ڈاکٹر خالد غزنوی (اکتوبر 1987ء) طب نبوی اور جدید سائنس.....صفحات 147، 194، 157

5۔ بخاری شریف، کتاب الطب، باب الدواء بالعسل

☆☆☆☆

حمدیہ

جب دکھوں کی کالی چادر میری جاں پر تن گئی
یاد تیری نورِ رحمت میرے حق میں بن گئی

صورتِ کہسار میں نے استقامت مانگ لی
جب بھی باطل قوتوں کے ساتھ میری ٹھن گئی

میرا حاصل رب عالم ہے فقط تیری رضا
روٹھیں سب پروا نہیں جب ذات تیری من گئی

ہو گیا تیرا توکل عزم کا جس دم رفیق
راستوں کے پیچ سلجھے اور سب الجھن گئی

آبیاری تجھ پہ ایماں کی نہیں جس کو نصیب
اڑ گئے سب رنگ اس کے، رونق گلشن گئی

تیری قربت کی ملی احساس کو جب زندگی
قلب کی ڈھارس بندھی اور ہیبت دشمن گئی

ام عبد منیب

قطعات

جو آج ہنستا ہے مجھ پر گلاب تازہ ہے
ایسے بھی وقت نے کچھ دیر کو نوازا ہے

رواج پھولوں کو رنگنے کا پڑ گیا ایسا
جمالِ غنچہ بھی منت پذیر غازہ ہے

.....

شدت سے بارشوں کی کھڑی فصلیں گل گئیں
کیا کیا گلاب چہرے خزائیں نگل گئیں

اپنے ہی آنگنوں کے درختوں کی چھاؤں میں
کچھ لڑکیاں بغیر چتاؤں کے جل گئیں

.....

اس کے آنگن میں جو اتری میری چاہت کی کرن
کھینچ دی دیوار اس نے اپنے گھر کے سامنے

روشنی لیکن پئے افکار کرتی ہے سفر
رکھتی ہے منظر کھلا اپنی نظر کے سامنے

.....

نجمہ یاسمین یوسف

وفا

(وَاِبۡرٰهِيۡمَ الَّذِىۡ وَفّٰٓى)

چلو کہ اب یہ تو طے ہوا ہے

وفا کا نام ونشاں نہیں ہے

وفا کی کشتی کے سب مسافر

وفا کے رستے کے سارے راہی

وفا پہ جانیں لٹا چکے ہیں

جو چند تھے وہ بھی تھک چکے ہیں

وہ اپنے زخموں کو تک رہے ہیں

کبھی کبھی میں یہ سوچتی ہوں

رہِ وفا کس قدر کٹھن ہے

قدم قدم پر مصیبتیں ہیں

بلائیں اور آزمائشیں ہیں

چہار جانب ہیں خار بکھرے

لہو میں ڈوبی ہیں خواہشیں بھی

ہیں مضطرب سب سماعتیں بھی

وفا جو روحوں کا گہرا دکھ ہے

وفا جو اشکوں کی برکھارت ہے

وفا جو آنکھوں کا نور مانگے

وفا جو تن کا لہو بھی مانگے

کبھی کبھی میں یہ سوچتی ہوں

اسی وفا سے کنارہ کرلوں!

وفا یہ کیا ہے؟ اسی وفا نے

مری نگاہوں کا نور چھینا

میرے جنوں کا سکون چھینا

اسی نے مجھ کو مجھی سے چھینا

مگر میں پھر خود سے پوچھتی ہوں

کہ کیا وفا سے کنارہ کرلوں؟

نہیں نہیں یہ جواب آیا

لگیں جو کانٹے تو غم نہیں ہے

بہیں جو آنسو تو دکھ نہیں ہے

فنا ہوا پنا وجود تب بھی

بدن ہو زخموں سے چور تب بھی

میں خود تو مٹی میں جا ملوں گی

وفا کو لیکن امر کروں گی

عذرا مریم خان

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

خون کی ایک بوتل

کہانیوں کے ان کرداروں سے اکثر آپ کی ملاقات ہوتی ہے۔ آپ کے دل اور زبان شک، شکوہ اور بدگمانی سے آلودہ ہوجاتے ہیں کیونکہ آپ کے سامنے تصویر کا صرف ایک رخ ہوتا ہے۔ یہ دوسرا رخ بھی ملاحظہ کیجیے۔ شاید آپ کے دل پر سکون کا نزول ہو۔ بعض دفعہ جو دکھائی دیتا ہے وہ حقیقت نہیں ہوتی۔

جانے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہم میں اتنا ظرف، برداشت، حوصلہ اور صبر ہونا چاہیے کہ خود کو اس صورتحال میں نارمل رکھیں اور جب تک اصلیت واضح نہ ہوجائے کسی ردعمل کا اظہار نہ کریں۔ بدگمانی سے پہلے خوش گمانی سے کام لیں۔

چوتھی گھنٹی پہ ڈاکٹر زویا نے فون اٹھالیا۔

ہیلو.....کون.....؟ آنکھیں بند تھیں نیند سے بوجھل جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

جی میں فریدہ سٹاف بول رہی ہوں.....ایمرجنسی سے.....

ایمرجنسی کا نام سنتے ہی زویا نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور سامنے وال کلاک کی طرف دیکھا.....رات کے دو بج رہے تھے۔

ہاں کہو.....کیا ہے.....؟

ایک کیس آیا ہے خون بہت ضائع ہوگیا ہے، بی پی بمشکل 40/100 ہے۔ ڈرپ میں نے لگا دی ہے، ٹیسٹ بھجوا دیئے ہیں۔ وہ سانس لینے کو رکی۔ خون کا انتظام.....اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اچھا میں آرہی ہوں۔

زویا نے اوور آل اٹھایا، چپل پہنے اور گھر سے نکل کر ایمرجنسی کی طرف دوڑ لگا دی۔

ڈاکٹر زویا پچھلے ایک سال سے ایمرجنسی ڈیوٹی کر رہی تھیں۔ بس دن رات بھاگ دوڑ رہتی۔ ابتداء میں اس کا تقرر تین ماہ کے لیے ہوا تھا۔ لیکن جب ڈاکٹر صائمہ کی باری آئی تو اس نے کہا کہ میرا بچہ ایک سال کا ہے میں یہ ڈیوٹی نہیں کرسکتی ورنہ ریزائن کردوں گی۔

بس اسی طرح ایک سال ہوچلا تھا۔

وہ جلدی سے برآمدے میں پہنچی۔ ہسپتال کے احاطے میں ایمرجنسی ڈیوٹی والے ڈاکٹر کا گھر بنا ہوا تھا۔ چنانچہ تین منٹ میں زویا اندر تھی۔ برآمدے میں مریضہ کے رشتے داروں کا ہجوم تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں.....دیہاتی اور خون کے نام سے ڈر کر بھاگ جانے والے۔

اندر مریضہ واقعی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی رنگ زرد بلکہ سفید، آنکھیں بند، آکسیجن لگی ہوئی تھی ڈرپ جاری تھی۔ زویا نے نبض پہ ہاتھ رکھا، پھر بچے کے دل کی دھڑکن، اس کے سارے جسم پر ملا ہوا تیل اور ریت اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ کافی دیر سے تکلیف میں تھی۔

اس کے ساتھ کون ہے.....ذرا اسے بلاؤ، ہسٹری لینی ہے۔

ایک تیز طرار سی عورت اندر آئی۔

ڈاکٹر صاحب دو دن سے دردیں آرہی تھیں بس اچانک طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ میں نے جلدی سے کہا کہ گاڑی کا انتظام کریں اور ہسپتال لے جائیں۔ لیکن کافی دور گاؤں سے آتے آتے

چار گھنٹے لگ گئے۔

زویا نے اس کی کہانی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا، اس کے سارے جسم پر ریت کیوں لگی ہوئی ہے۔

جی ہم گاؤں میں زمین پر ریت بچھا کر مریضہ کو لٹاتے ہیں۔

تا کہ خوب انفیکشن ہو اور بچہ اسی ریت میں.....

نہ جی نہ..... بچے کا تو ہم بہت خیال رکھتے ہیں مجھے سب فیکشن کا پتہ ہے جی کالی فائیڈ دائی ہوں ڈسٹرکٹ ہسپتال سے کورس کیا ہے.....قسم لے لیں۔

میں نے تو اپنی فیس بھی نہیں لی جی ایک ٹکا نہیں لیا۔ ہمدردی میں ساتھ چلی آئی ہوں۔ نیند برباد کی ہے جی اپنی.....

اچھا جاؤ لیبارٹری میں جا کر خون ٹیسٹ کراؤ۔ اس کو بلڈ کی شدید ضرورت ہے۔ آپریشن کرنا پڑے گا۔

جی میں تو خون نہیں دے سکتی خود بہت کمزور ہوں۔ آپ کوشش کریں کہ خون کے بغیر ہی کام ہو جائے جی، بہت غریب ہیں آپریشن سے بچالیں۔

باتیں ہی بناتی رہو گی.....اس کے رشتے داروں سے کہو خون ٹیسٹ کرائیں۔فریدہ سٹاف نے کہا۔

ڈاکٹر زویا نے الٹرا ساؤنڈ مشین سے بچے کے دل کی دھڑکن تلاش کی لیکن کنفرم نہ ہو سکی۔

دائی نے پوچھا، جی بچہ زندہ ہے نا.....؟

نہیں..... مجھے Fetal heart نہیں ملے۔ اب تو ماں کی جان بچانی ہے۔ یہ پہلا بچہ ہے؟ جی نہیں..... پہلے تین بچے ہیں سارے میرے ہاتھ سے ہوئے ہیں.....بالکل نارمل کبھی کچھ نہیں ہوا۔

ڈاکٹر نے خود لیبارٹری میں فون کیا اس وقت عاطف ڈیوٹی پر تھا۔

ہیلو.....السلام علیکم.....

میں ایمرجنسی سے بول رہی ہوں ابھی ایک مریضہ آئی ہے اس کا نام عذرا ہے بہت بلیڈنگ ہو گئی ہے۔ اس کا بلڈ گروپ جلدی سے چیک کر کے بلڈ بینک سے ایک پائنٹ بلڈ دیدو، بعد میں پے منٹ کر دوں گی۔

ان کے جتنے رشتے دار ہیں سب کا گروپ چیک کرو، اور بلڈ لے لو۔ کم از کم تین بوتلیں اور ہو جائیں تو بہتر ہے۔

مگر میڈم یہاں تو ابھی تک ایک بھی ڈونر (خون دینے والا) نہیں آیا۔

اچھا.....ذرا ایمرجنسی وارڈ کے باہر دیکھو.....

او کے.....

فریدہ تھیٹر لے چلو، میں آ رہی ہوں۔ ڈاکٹر طارق آ گئے ہوں گے۔

میڈم بغیر بلڈ کے سزیرین کیسے کر سکتے ہیں؟ فریدہ نے تشویش سے کہا۔

عاطف سے کہہ دیا ہے، ایک بوتل بلڈ بینک سے دے رہا ہے۔

ڈاکٹر زویا جونہی باہر نکلیں سامنے ہی چار مرد اور دو عورتیں کھڑی تھیں۔ایک عورت نے آگے بڑھ کر زویا کے آگے ہاتھ جوڑے۔

ڈاکٹر صاحب غریب لوگ ہیں آپریشن نہ کریں۔

آپ سب لوگ جا کر خون کا گروپ ٹیسٹ کرائیں خون کی ضرورت ہے۔

جی میں تو بوڑھی اور بیمار ہوں کیسے دوں گی۔

یہ سارے تو محلے دار ہیں.....ان کی مہربانی ہے کہ یہ ہمارے ساتھ چلے آئے۔اس کا خاوند کہاں ہے.....؟

وہ جی مزدوری کرنے کراچی گیا ہوا ہے۔

تو آپ لوگ ہی ٹیسٹ کروا دیں آپ کو ایک بوتل خون دینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن عذرا کی جان بچ جائے گی۔

مرد خاموش رہے۔

زویا آگے بڑھ گئی.....تھیٹر میں سارا عملہ موجود تھا۔ٹرالی تیار تھی۔سٹاف واش اپ ہو رہی تھی۔ڈاکٹر طارق بے ہوشی کی دوا سرنج میں بھر رہے تھے زویا کو دیکھتے ہی بولے۔

مریضہ کی حالت تشویشناک ہے۔ بلڈ کا انتظام ہے؟

ڈاکٹر کوئی بھی بلڈ دینے کو تیار نہیں ہے۔ میں نے عاطف سے کہا ہے کہ بلڈ بینک سے ایک بوتل دے دے۔

اتنے میں عاطف دوڑا آیا۔

ڈاکٹر جی اس کا تو اونیگٹو بلڈ ہے.....اور اس وقت اتفاق سے بلڈ بینک میں اونیگٹو موجود نہیں ہے۔

تم ہسپتال میں کسی کو جانتے ہو کہ اس کا گروپ ہو اور وہ خون دینے پر آمادہ ہو جائے؟ ڈاکٹر زویا ابھی تک پرامید تھیں۔

اس وقت رات کے تین بجے ہیں صبح ہی کچھ ہو سکے گا۔

تمہاری ڈیوٹی صبح چھ بجے ختم ہو جائے گی۔ لیکن تم گھر نہیں جاؤ گے۔ جیسے بھی جہاں سے بھی ہو سکے اونیگٹو خون کی ایک بوتل کا انتظام کرو گے وارڈ میں سٹاف کو دے کر جانا ہے۔ یاد رکھنا.....

ڈاکٹر جی صبح میں نے گاؤں جانا ہے.....ضروری کام ہے..... میں امجد کو کہہ دوں گا.....

تمہارا کام ایک انسانی زندگی سے زیادہ ضروری تو نہیں ہے۔ جس نے ایک انسان کی زندگی بچائی گویا اس نے تمام انسانیت کو بچایا.....

اچھا جی.....جیسے آپ کی مرضی

ساتھ ساتھ زویا خود بھی واش اپ ہو گئی۔ اب وہ ہاتھوں پر دستانے پہن رہی تھی۔ ڈاکٹر زویا.....بغیر بلڈ کے یہ اپریشن خطرناک ہوگا۔ سوچ لیں، میں تو بے ہوشی دے دوں گا۔

ہم نے آپریشن نہ بھی کیا تو اس کی ڈیتھ ہو جائے گی۔ اب ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اسے کیسے مرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں؟ ہمت کریں اللہ پاک دیکھ رہے ہیں..... وہ خود ہی ہماری مدد فرمائیں گے۔

اچھا جی.....بسم اللہ کریں.....

انہوں نے ماسک مریضہ کے منہ پر رکھا جو پہلے ہی نیم بیہوش تھی۔ ڈاکٹر زویا نے پھرتی سے سٹارٹ لیا اور سات منٹ میں آپریشن مکمل ہو گیا۔

ڈاکٹر طارق نے ستائشی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

آپ کا بڑا حوصلہ ہے.....آپ نے ریکارڈ قائم کر دیا ہے اتنی جلدی! مجھے ڈر تھا کہ طویل بے ہوشی اس کو نقصان دے گی.....آپ بے شک اب اس کو آؤٹ کر دیں۔

اب امید ہے کہ اگر ایک بوتل لگ جائے تو انشاء اللہ جان بچ جائے گی.....ڈاکٹر طارق پلیز آپ ذرا بے بی کو دیکھ لیں.....

جی اچھا.....

زویا نے مریضہ کو صاف کرنا شروع کیا۔ زخم پر ڈریسنگ کی فریدہ بولی آپ جائیں.....ہم ٹرالی پر شفٹ کر لیں گے.....نہیں اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے میں خود ساتھ رہوں گی.....اتنے میں بچے کے رونے کی آواز آئی۔

الحمدللہ!

سٹاف نے بے بی کو کپڑے پہنا کر ڈاکٹر زویا کو لا کر دکھایا۔

بے بی گرل ہے ڈاکٹر جی.....

ڈاکٹر زویا نے اسے ٹرالی پر لٹا کر اس کا مکمل معائنہ کیا۔ ڈاکٹر طارق نے اپنا سامان سمیٹا اور جانے کی اجازت مانگی۔

ڈاکٹر صاحب کیا مریضہ خطرے سے باہر ہے؟

جب تک اس کو بلڈ نہیں لگے گا خطرہ تو ہے.....انہوں نے جواب دیا۔

پھر آپ اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں؟ زویا نے سوال کیا۔

میری صبح آپریشن لسٹ بہت لمبی ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کی سرجری کی لسٹ ہے دونوں تھیٹر مصروف ہوں گے اور صبح چھ بجے آنا ہے۔

اب پانچ تو بج گئے ہیں.....ڈاکٹر زویا بولی۔

فریدہ وارڈ میں فون کر کے کہو کہ ڈاکٹر طارق کے لیے چائے اور ناشتہ یہاں ہی بھجوا دیں۔

تھینک یو ڈاکٹر زویا.....اس وقت چائے کی بڑی طلب ہو رہی تھی۔ بہت شکریہ آپ نے کتنے بجے آف ہونا ہے۔

میری ڈیوٹی تو آٹھ بجے تک ہے۔ دوسری ڈاکٹر آئے گی تو اس کو چارج دے کر جا سکوں گی۔لیکن مجھے ڈر ہے کہ عذرا کے لیے بلڈ کا انتظام کیسے ہو سکے گا۔ ڈاکٹر طارق آپ کے جاننے والوں میں سے کسی کا او نیگٹو بلڈ گروپ ہے.....؟

ڈاکٹر کفایت کی لیبارٹری میں ایک لڑکا ہے اجمل، وہ پہلے بھی کئی دفعہ بلڈ دے چکا ہے۔

پلیز اگر اس کا نمبر ہے تو ذرا فون کر کے چیک کریں۔ جب تک خون کی بوتل نہیں آتی میں نہیں جا سکتی.....

ویسے ایمرجنسی کی ڈیوٹی مشکل ہوتی ہے نا ڈاکٹر زویا..... میں نے تین سال کی ہے.....لیکن پھر پوسٹ گریجویشن کرنے چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر طارق نے عذرا کا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے بتایا۔

لیکن بے ہوشی میں بھی ایمرجنسی کال تو آتی رہتی ہے نیند تو ڈسٹرب ہوتی ہے نا.....

میری نیند پوری نہ ہو تو سارا دن طبیعت خراب رہتی تھی۔ پہلے کی بات ہے جب سکول کالج میں تھے، 8 بجے ابا جان کا حکم ہوتا تھا سو جاؤ۔ اگر ہوم ورک کا بہانہ بناتا تو ایک گھنٹے کی رعایت مل جاتی۔ وہ ہم بہن بھائیوں کے کمرے خود چیک کرتے، لائٹ بند کرتے اس وقت بالکل وہ ہوسٹل کے وارڈن لگتے تھے۔لیکن اب جب ہم خود صاحب اولاد ہو گئے ہیں تو قدر آتی ہے کہ ابا جی کا ڈسپلن بہت اچھا تھا۔ اچھا میں اجمل کا پتہ کرلوں۔

اتنے میں وارڈ بوائے ناشتے کی ٹرے لے کر داخل ہوا۔

ڈاکٹر زویا نے رجسٹر میں اندراج مکمل کیا۔ آپریشن کا ٹائم لکھا۔ اور عذرا کا جسم دیکھا..... نبض پہ ہاتھ رکھا اور اسے آواز دی..... عذرا..... عذرا..... عذرا..... کان دبایا..... ماتھے پر انگوٹھے سے دبایا.....

لیکن کوئی ردعمل نہ ہوا وہ تھوڑی سی فکر مند ہو گئیں.....اور دل ہی دل میں اپنے رب سے ہمکلام ہوئیں۔

اسے زندگی عطا فرما دے.....میرے مولا یہ بچی جو پیدا ہوئی ہے.....بن ماں کے رہ جائے گی.....آپ تو رحیم و کریم ہیں.....

ساتھ ہی بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ ڈاکٹر طارق اس کا بلڈ پریشر بہت نیچے چلا گیا ہے۔

اس کے پاؤں اونچے کریں.....اور ڈرپ تیز کر دیں..... بلکہ یہ تو ختم ہو گئی ہے دوسری ڈرپ لگائیں..... اس کا جسم بھی ٹھنڈا ہے..... ہیٹر آن کر دیں.....

فرید الماری سے کمبل نکال دو.....اور ادھر اس کے سامنے ٹیبل پر ہیٹر رکھو.....کیا بنا اجمل کا.....؟

وہ نماز پڑھنے مسجد گیا ہوا ہے..... واپس آ کر مجھے فون کرے گا..... میں نے اپنا نمبر دیدیا ہے۔

ہائے اس وقت تو نماز سے زیادہ ضروری کسی کی جان بچانا تھا۔ یا اللہ جلدی آ جائے۔

آئیں ڈاکٹر صاحبہ چائے پی لیں.....فریدہ نے انہیں کپ پکڑایا.....انہوں نے ایک گھونٹ بھرا تو بولیں..... بڑی اچھی چائے ہے کس نے بنائی ہے۔

ساری رات کے جاگے ہوئے بندے کو چائے مل جائے تو اچھی ہی لگے گی۔ فریدہ! عاطف کو فون کرو کہ وہ کہیں سے او نیگٹو کا پتہ کرے۔ ڈاکٹر زویا ریڈیو پر اناؤنسمنٹ کروا دیں۔

ویسے دیکھیں نا ڈاکٹر طارق اتنا بڑا گورنمنٹ کا ٹیچنگ ہسپتال ہے اور اس کے بلڈ بینک میں او نیگٹو بلڈ نہ ہو کتنے شرم کی بات ہے۔

وہ تو ہے، آپ ہی کوئی مہم چلائیں گرلز کالج میں کیمپ لگائیں۔

لڑکیاں ویسے تو ڈرپوک ہوتی ہیں مگر شائد بلڈ دے دیں..... آپ ایم ایس سے ملیں..... میں بھی کہوں گی۔

فریدہ نے عذرا کی نبض دیکھی۔ ڈاکٹر صاحب اس کی Pulse نہیں مل رہی۔

دونوں ڈاکٹر اپنی اپنی چائے چھوڑ کر مریضہ کی طرف لپکے۔ ڈاکٹر طارق نے جلدی سے بلڈ پریشر دیکھا اور پھر ایک انجکشن ڈائریکٹ دل کی جگہ پر لگایا۔

ایک ٹیکہ ڈرپ میں ڈالا۔

نبض بھی مل گئی بلڈ پریشر بھی ذرا اوپر آ گیا۔

اتنے میں اجمل کی کال آ گئی۔

ڈاکٹر صاحب وہ تو کہہ رہا ہے کہ میں نے پندرہ دن پہلے ایک بوتل دی ہے۔اب تین ماہ سے پہلے نہیں دے سکتا۔

اچھا اسے کہیں کہ صرف ایک سوسی سی دے دے یا پھر کسی اور کا پتہ بتائے، زویا بولی۔

سوسی سی سے اس کا کیا بنے گا..... اس کو تو تین پائنٹ لگیں گے۔

اس کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیں۔ابھی اس آپریشن تھیٹر کی ضرورت پڑے گی۔اتنے میں بچی نے رونا شروع کر دیا۔

اس کو تو بھوک لگی ہے ڈاکٹر کیا کروں.....

گلوکوز کا ایک ایمپول توڑ کر چمچہ سے اسے پلا دو.....

دروازہ کھلا اور دن کی ڈیوٹی والا سٹاف برکت اور صادق، صائمہ،نورین،نویدہ اور صبا اندر داخل ہوئیں۔

السلام علیکم.....واہ آج تو ڈاکٹر زویا سے ملاقات ہوگئی۔جب سے ایمرجنسی میں آئی ہیں عید کا چاند ہوگئی ہیں۔کیا حال ہیں آپ کے ڈاکٹر..... یہ نورین تھی سب سے سینئر سٹاف سارے آپریشن تھیٹر کی انچارج۔انتہائی محنتی اور ایماندار ہمدرد اور صاف گو.....سبھی لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

نورین اس وقت تو ایک اونیگٹو بلڈ کی سخت ضرورت ہے..... اپنا حال بعد میں بتاؤں گی..... مجھے پتہ ہے آپ ضرور انتظام کر دیں گے۔

لو جی یہ کیا مشکل ہے۔

اپنی صبا اونیگٹو ہے۔ابھی ٹیبل پر لٹائیں اور ایک پائنٹ لے لیں.....مجال ہے جو یہ اف بھی کرے.....

بھئی ڈاکٹر زویا کو کون انکار کر سکتا ہے۔ان کیلئے میری جان بھی حاضر ہے.....لیکن میری ڈیوٹی کون کرے گا.....میں پہلے بھی چھ دفعہ خون دے چکی ہوں.....میرا گروپ ہی اتنا قیمتی ہے.....

ہاں بھئی نورین بولو.....اس کی ڈیوٹی کون کرے گا.....

دیکھا ڈاکٹر طارق! آپ کہہ رہے تھے لڑکیاں ڈرپوک ہوتی ہیں..... چھ دفعہ بلڈ دے چکی ہے۔

وہ مسکرائے.....آپ نے ادھار نہیں رکھا.....صبا تو واقعی بہادر نکلی.....فرید! چلو عاطف کو فون کرو کہ بلڈ لے لے.....

میرے پاس تو ہوسٹل میں کوئی لڑکی نرس نہیں ہے جو اس کی جگہ ڈیوٹی کر سکے۔

ویسے ڈاکٹر زویا بلڈ کا انتظام کرنا تو رشتے داروں کا فرض ہے آپ کیوں جان ہلکان کر رہی ہیں.....

ایک زندگی کو بچانا ہمارا فرض ہے۔اس کے تین بچے ہیں،ان کو تو ماں کی ضرورت ہوگی۔جو ہم سے ہو سکے ہمیں کرنا چاہیے۔اس پروفیشن کا نہیں انسانیت کا تقاضا ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

عاطف نے آ کر پوچھا.....سٹاف صبا آپ نے واقعی میں بلڈ دینا ہے تو آ جائیں۔

ہاں ہاں بالکل.....دوں گی.....یہ نیکی ہے.....

ویسے ڈاکٹر صاحبہ میرا ایک دوست ہے ناصر اس کا گروپ نیگٹو ہے۔میں نے فون کر دیا ہے بس آنے ہی والا ہوگا۔اس کی ماشاءاللہ صحت بہت اچھی ہے اور اس نے پہلے کبھی خون نہیں دیا۔سسٹر صبا تو بہت دفعہ دے چکی ہیں۔

زویا تھک کر نیچے فرش پر بیٹھ گئی۔اور چارٹ پر نوٹس لکھنے لگی

دو بجے مریض ایمرجنسی میں آیا۔دو دنوں سے لیبر میں تھی۔تین بچے پہلے ہیں یہ چوتھا ہے.....خون کا گروپ اونیگٹو نہیں ملا۔رشتے دار غائب، 2.30 منٹ پر سزیرین ہوا۔زندہ بے بی گرل، بیٹی پیدا ہوئی۔مریضہ سیریس۔Hb ہیموگلوبن صرف 4 ہے جبکہ نارمل 16 ہوتی ہے۔بلڈ پریشر 50/Nil ایک گھنٹے بعد 70/20.....اس دوران ایک

بوتل خون نہ مل سکا۔ بلڈ بینک میں اونیگیٹو خون موجود نہیں ہے اس کا نوٹس لیا جائے۔

اس جملے کو سرخ پنسل سے ہائی لائیٹ کر دیا۔

صبح چھ بجے مریض کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا۔ خون کا انتظام نہیں ہو سکا۔ تین بوتل اونیگٹو مریضہ کو لگایا جائے۔ انتہائی اہم ڈاکٹر زویا۔

فریدہ نے کہا.....اب عذرا کی حالت بہتر ہے اب ڈیوٹی روم میں جا کر تھوڑی دیر ڈاکٹر زویا لیٹ جائیں۔

ایک بلڈ لگ جائے پھر میں کمرے میں چلی جاؤں گی۔

عاطف کا فون آیا۔ فریدہ ڈاکٹر زویا کو بتا دو بس دس منٹ میں خون کی بوتل لے کر آ رہا ہوں۔

الحمدللہ..... اس نے اٹھ کر عذرا کے سارے Parameters چیک کیے، نبض، دل کی دھڑکن، آنکھ کی پتلی کا ردعمل اور بلڈ پریشر۔

فریدہ میں ذرا واش روم جا رہی ہوں آج کی نماز بھی گئی۔ اب قضا پڑھ لوں گی۔ بلڈ آ جائے تو لگا دینا۔

ٹھیک ہے آپ تسلی سے جائیں میں اس کے پاس ہوں.....کیا بچی رشتے داروں کو دیدوں.....؟

ہاں دے دو ان کو تسلی ہو جائے گی.....

جب وہ واپس آئی.....تو فریدہ گھبرائی ہوئی اس کو آکسیجن لگا رہی تھی.....

ایک ڈاکٹر اس کو مصنوعی سانس دلا رہا تھا۔

کیا ہوا.....فریدہ کیا ہوا.....

بی بی پلس نل ہو گیا ہے..... زویا نے نبض دیکھی.....اور کلمہ طیبہ پڑھا.....انا للہ وانا الیہ راجعون.....اوہ میرے اللہ جی..... پانچ سات منٹ کی کوشش جاری رہی پھر اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

اتنے میں عاطف بلڈ بیگ لے کر آیا۔

یہ لیں فریدہ سٹاف بلڈ آ گیا ہے۔ اس کی آواز میں امید کی چمک اور کامیابی کا افتخار جھلک رہا تھا۔

ڈاکٹر زویا نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا.....

اس کو ابن انشاء کا ایک شعر یاد آیا

اب وہ آئے تو یہ کہنا کہ مسافر تو گیا

اور یہ کہنا کہ کیا اب بھی نہ جاتا لوگو

اس نے چپ چاپ چارٹ پر ڈیتھ نوٹ لکھا۔ نیچے اپنے دستخط کیے اس کی آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں۔ چارٹ فریدہ کو دیتے ہوئے اس نے کہا۔ ڈیڈ باڈی رشتے داروں کے حوالے کر دینا۔ میں کمرے میں جا رہی ہوں۔

تھوڑی دیر وہ افسردہ سی چھت کی طرف دیکھتی رہی کہ زندگی اور موت تو اللہ کے اختیار میں ہیں، ہم ڈاکٹروں کو کیوں یہ زعم رہتا ہے کہ ہم کچھ کر سکتے ہیں۔

دھیرے دھیرے اسے نیند آ گئی۔ شام چار بجے اس کی آنکھ کھلی تو سرہانے ایک نوٹس پڑا تھا۔

کل ایم ایس کے دفتر میں اس کی انکوائری تھی کہ عذرا بی بی کی موت ڈاکٹر کی غفلت کی وجہ سے ہوئی۔ وہ دم بخود رہ گئی.....اس کے ہاتھوں سے کاغذ گر گیا۔ دوسرے دن کے اخبار ''خبروں'' سے بھرے ہوئے.....سرکاری ہسپتال قتل گاہ ہے۔ ڈاکٹر زویا کو مستعفی کیا جائے۔ ہمیں ایسی ناکارہ ڈاکٹر نہیں چاہیے۔ جب اندر انکوائری ہو رہی تھی باہر لوگ نعرے لگا رہے تھے۔

ایم ایس نے چارج شیٹ سنائی اور پوچھا کہ ڈاکٹر زویا آپ کیا کہتی ہیں.....

سر..... دو بجے مریضہ ہسپتال لائی گئی.....تب سے اس کی ڈیتھ تک میں ایک لمحہ بھی اس سے جدا نہیں ہوئی۔ یہ چارٹ دیکھ لیں۔ ایک ایک لمحے کی رپورٹ موجود ہے۔ اس کا خون بہت زیادہ نکل گیا تھا۔ اونیگٹو بلڈ کا انتظام نہیں ہو سکا۔ بلڈ بینک میں اس گروپ کا خون نہیں تھا.....

اچھا ان لوگوں کے ساتھ کچھ سیاسی پارٹی کے لوگ ہیں..... کیونکہ الیکشن آنے والے ہیں انہوں نے اس ڈیتھ کو ووٹوں کا ذریعہ

بنانا ہے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ کسی صورت سمجھنے کو تیار نہیں ہیں وہ یہ کیس عدالت میں لے کر جانا چاہتے ہیں۔

ضرور لے کر جائیں میں سب کا سامنا کروں گی۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے.....ڈاکٹر طارق اور سٹاف اور فریدہ گواہ ہیں۔

عدالت میں کوئی گواہی نہیں دے گا.....سوچ لیں.....

پھر میں کیا کروں سر آپ ہی بتا دیں۔

آپ ابھی استعفیٰ لکھ دیں اور شام کی گاڑی سے گھر خانیوال چلی جائیں ایک ماہ کی چھٹی گزاریں..... جب تک حالات ٹھیک ہو جائینگے .....

ٹھیک ہے سر.....

اس نے چپ چاپ استعفیٰ لکھا ایم ایس کی میز پر رکھا اور باہر نکل آئی.....

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

اچانک گھر آنے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب نے پوچھا کتنی چھٹی آئی ہو.....

اس نے کہا اب لمبی چھٹی ہوگئی ہے.....میرا دل اکتا گیا ہے۔ میں باہر پڑھنے جانا چاہتی ہوں۔ میں سرکاری نوکری نہیں کروں گی۔ والد نے سمجھایا بیٹا میں نے ساری عمر سرکاری نوکری کی ہے اس میں بڑے فائدے ہوتے ہیں۔ اور اپنے ملک کی خدمت بھی ہے۔

اس نے بے بس نظروں سے دیکھا۔

ہاں ابو ایک بوتل خون کے بدلے جان چلی جاتی ہے۔

اور ایک ڈیڈ باڈی ..... الیکشن میں کامیابی کا زینہ بن جاتی ہے۔

محنت، اصول، جگر اتا ..... تینوں کے ساتھ عزت چلی جاتی ہے۔

اس کے والد چپ کے چپ رہ گئے.....ان تین جملوں سے ساری کہانی سمجھ میں آ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆.....☆

ربیعہ ندرت

وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں

شروع سے لے کر اب تک بے شمار خوش فہمیاں، غلط فہمیاں اور کم فہمیاں میرے اور میری ذات کے درمیان ایک بلند و بالا اور نا قابل تسخیر دیوار بن کر کھڑی ہیں اور اس دیوار کی بدولت میری رسائی میری ذات تک نہیں ہو پاتی۔ اگر چہ کبھی کبھار دل چاہتا ہے کہ اس دیوار کو گرا کر خلوت میں محترمہ سے شرف باریابی حاصل کیا جائے تا کہ میں جس شخصیت کے سائے تلے زندگی گزار رہی ہوں، اس کا کچھ تو سراغ ملے۔ لیکن اس خواہش کے ساتھ ہی میرے کانوں میں آوازیں آنے لگتی ہیں۔

پردہ..... بیبیو..... پردہ.....

پردے میں رہنے دو..... پردہ نہ اٹھاؤ.....

پردہ جو اٹھ گیا.....تو بھید کھل جائے گا.....

بھید کھلنے کی دھمکی سے میں خود لرز جاتی ہوں اور ملاقات کی خواہش اسی وقت دم توڑ دیتی ہے۔ کیونکہ میں اس ذات گرامی کی خامیوں، خرابیوں اور کوتاہیوں کی تاب نہیں لا سکتی اور نہ ہی ان تلخ حقائق کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہوں۔ اس لیے میں اس آواز کے جواب میں فوراً کہتی ہوں۔

''مجھے اس سے کیا لینا دینا، کہاں میں اور کہاں وہ، میرا اس کا کیا ملاپ مجھے اس سے نہیں ملنا، رہنے دو اس ملاقات کو، مٹی پاؤ جی مٹی پاؤ.....

آج سے بیس بائیس سال پہلے جب میں نے گاڑی چلانا سیکھی تو حسب معمول دل میں عجب خوش فہمی نے ڈیرہ جمایا کہ اب میں اچھے اچھوں کے پرکاٹ سکتی ہوں اور یہ کہ محض چند روزہ مشق کی بدولت میرا شمار اب ایسے ہوشیار اور باکمال ڈرائیوروں میں ہو گیا ہے جو لاجواب پرواز کے لیے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب کبھی ڈرائیونگ کرتے ہوئے اپنے آس پاس کی رواں دواں گاڑیوں کو دیکھ کر مجھے اپنی برتری کا احساس ہوا اور میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو داد دیتے ہوئے کہا۔

ہم سا ہو تو سامنے آئے.....

عین اسی وقت میری گاڑی کے سامنے کبھی کوئی کھمبا، کبھی کوئی ستون یا درخت آ گیا اور گاڑی میرے ہاتھوں سے پھسل کر بے اختیار اس سے جا ٹکرائی۔ حادثے کے فوراً بعد میں نے جب بھی اس کی وجوہات پر غور کیا تو مجھے اپنے ہنر پر کبھی شک نہ ہوا بلکہ ہمیشہ مذکورہ بالا اشیاء ہی قصوروار قرار پائیں۔ مقام شکر ہے کہ میری گاڑی کبھی دوسری کسی گاڑی سے نہیں ٹکرائی ورنہ دوسری گاڑی کا ڈرائیور شاید میری تحقیق کے نتائج سے اتفاق نہ کرتا اور میرے حق میں اس اختلاف کا انجام یقیناً سنگین ہوتا۔ کیونکہ بے جان چیزوں کے بارے میں یکطرفہ فیصلہ کرنا بے حد آسان اور بے ضرر ہوتا ہے اور اس فیصلے سے فریقین کا بھلا ہو جاتا ہے کہ بے جان چیزوں کا کچھ نہیں بگڑتا اور انسان کی خود اعتمادی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ایک دن میں ایک پرہجوم سڑک پر گاڑی چلا رہی تھی کہ گاڑی چلاتے چلاتے میں نے آس پاس کی گاڑیوں کی فاش غلطیوں کو نوٹ کرنا شروع کر دیا۔ کسی کی رفتار ٹھیک نہیں تھی، کسی کا رنگ خوش کن نہیں تھا، کسی کا حجم مناسب نہیں تھا، کسی گاڑی کی بریک تسلی بخش نہیں تھی، میں انہی خیالات میں گم تھی کہ اچانک دھماکے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی گاڑی کا بایاں پہیہ کسی گڑھے میں پھنس گیا اور گاڑی رک گئی، میں نے باہر نکل کر صورت حال کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ جائے وقوع پر ایک گٹر واقع تھا۔ جس کا ڈھکنا غائب تھا اور میری گاڑی کا پہیہ اس گٹر میں دھنس گیا تھا۔ لمحہ بھر کیلئے میں پریشان ہو گئی لیکن پھر اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ۔

''اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔''

چنانچہ گاڑی کا دروازہ کھول کر میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور گاڑی سٹارٹ کر کے اس کے پہیے کو گٹر میں سے نکالنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے گٹر میں کوئی پوشیدہ آہنی ہاتھ اسے نیچے کی طرف کھینچے ہوئے تھے۔ چنانچہ گاڑی اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلی۔ بار بار کی ناکام کوششوں کے بعد میں گاڑی سے باہر نکل آئی اور اپنے آس پاس نظر دوڑائی۔

سڑک پر بے پناہ ہجوم تھا، چاروں طرف نفسا نفسی کا عالم تھا، بے ترتیب اور بے ہنگم ٹریفک جاری و ساری تھی، ہر طرف سے ہارن کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ بے صبر اور جلد باز انسان اندھا دھند تیزی سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان میں سے شاید کوئی جلد ہی میری مدد کو آ جائے گا لیکن خلاف توقع مدد کرنا تو درکنار، کوئی لمحہ بھر کیلئے رک کر میری روداد سننے کو بھی تیار نہ تھا۔

لوگ مجھ پر اور میری گاڑی پر اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر منہ پھیر کر جا رہے تھے۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اندھوں کے شہر میں بے یارو مددگار کھڑی تھی، جیسے میرے اردگرد احساس و جذبات سے عاری روبوٹ نما مشینی انسانوں کا ہجوم تھا۔ جیسے میرا اپنا ہی ملک اچانک میرے لیے اجنبی بن گیا تھا۔ پرایا دیس، انجان لوگ، ایسے میں پریشان حال مسافر جائے تو کہاں جائے، کہے تو کیا کہے، اندھوں کو کچھ دکھانے سے کیا فائدہ، بہروں کو کچھ سنانے سے کیا فائدہ، سب بے کار، سب لاحاصل۔

اس وقت میری تمام تر ضروریات زندگی سمٹ کر صرف ایک خواہش ایک تمنا، ایک دعا اور ایک نقطے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں میں اپنی انا کے بت کو توڑ کر دل ہی دل میں بھیک مانگ رہی تھی۔

''اللہ کے نام پر.....صرف ایک شناسا چہرہ، صرف ایک مانوس آواز، اپنائیت سے بھرا لہجہ، خلوص سے معمور چند حروف، حوصلہ افزائی کے لیے چند پرتسکین الفاظ، مدد کے لیے بڑھتے ہوئے ہاتھ، کوئی پرسان حال، کوئی ہمنوا، کوئی ہمدم، کوئی مونس، کوئی غمگسار، کوئی چارہ ساز، اللہ کے نام پر، صرف اللہ کے نام پر۔''

لیکن وہاں مجھے دان کون دیتا۔ وہ تو خود تنگ دامن، بے بہرہ، بے نوا، بے مہر، بے مروت، خالی ہاتھ، تہی دامن، سود و زیاں سے بے خبر، خسارے کی گود میں پروان چڑھنے والے نادان لوگ تھے۔ سنگلاخ پتھریلی اور بنجر زمین کی مانند، جس کے پاس کسی کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔

میں دم بخود، حیران و پریشان گاڑی کے پاس کھڑی ہو کر سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں، کسے پکاروں، کسے آواز دوں کہ اچانک انیس بیس سال کا ایک نوجوان لڑکا میرے سامنے آ کر رک گیا۔ وہ مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے کپڑے بہت پرانے اور میلے تھے اور ان پر جا بجا سفیدی کے داغ نمایاں تھے۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ شدید گرمی کی وجہ سے اس کے چہرے کے گندمی رنگ میں تانبے کے رنگ کی آمیزش ہو گئی تھی۔ میرے قریب آ کر وہ بڑے مودب لہجے میں مجھے کہنے لگا۔

''ماں جی! اگر آپ کہو تو میں آپ کی گاڑی کا پہیہ گٹر میں سے نکال دوں؟

بھلا اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میں نے فوراً اقرار میں سر ہلایا۔ اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے گاڑی کو مضبوطی سے پکڑا اور اسے اٹھا کر یوں سڑک پر رکھ دیا جیسے اس کے چھوتے ہی گاڑی کاغذ کی ناؤ بن گئی تھی۔

ہلکی پھلکی اور بے وزن۔

قحط الرجال کے اس دور میں مجھے وہ لڑکا کھرا، خالص اور فرشتہ نما انسان نظر آ رہا تھا۔ جیسے کوئلوں کے ڈھیر میں ہیرے کی کنی، جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی جھلمل جھلمل کرتی کرن، جیسے حبس زدہ ماحول میں ٹھنڈی خوشگوار ہوا کا جھونکا۔

میں سوچ رہی تھی کہ بسا اوقات ہمارے دل میں دوسرے انسانوں کے لیے محبت اور خیر خواہی کے خوابیدہ بیج مدتوں بے حس و حرکت پڑے رہتے ہیں۔ پھر اچانک ہماری زندگی میں کچھ ایسے سنہری لمحات بہار بن کر در آتے ہیں کہ یہ بیج آناً فاناً نمو پا کر لہلہاتے ہوئے تنومند پودوں کا روپ دھار کر دل کی دنیا پر چھا جاتے ہیں۔ تب ہمارا دل شکر گزاری اور احسان مندی کے جذبات کے ساتھ بے اختیار جھک جاتا ہے۔ بعض اوقات تو بہت اکھڑ اور آہن و فولاد کی مانند پتھر دل بھی اس لمحے کی برکت سے موم بن کر چشم زدن میں پگھل جاتے ہیں اور

بآسانی فتح کر لیے جاتے ہیں یہی معاملہ اب میرے ساتھ ہوا کہ وہ گمنام، اجنبی، انجان، بے وقعت اور بے مایہ سا لڑکا اپنے حسن سلوک کی وجہ سے اچانک میرے لیے بے حد معزز اور اہم ہو گیا تھا اور میں سوچتی چلی جا رہی تھی کہ اس کے اس احسان کا شکریہ کیوں کر ادا کروں۔

اچانک میری نظر اس کے چہرے پر پڑی۔ پسینے کے قطرے ٹپ ٹپ کر کے اس کی پیشانی سے گر کر اس کی قمیض میں جذب ہو رہے تھے۔ میں نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے کچھ پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پتر! گرمی زوروں پر ہے، تم کسی دکان سے ٹھنڈی بوتل لے کر پی لینا۔''

اس نے حقارت سے پیسوں کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

''ماں جی! میں نے آپ کو ماں کہہ کر عزت دی ہے اور مجھے پتر کہہ کر ذلیل کر رہی ہیں۔ جتنی دیر میری ماں زندہ رہی، میں جی جان سے اس کی خدمت کرتا رہا اور اس نے میری خدمت کا صلہ کبھی مجھے پیسوں کی شکل میں نہیں دیا۔ بھلا ماں بیٹے کے تعلق میں پیسے کا کیا کام؟ نہ ماں جی نہ.....اپنے بیٹوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا کرو۔''

اس کی آواز میں بلا کی کاٹ تھی اور اس کی گفتگو نے میری اس خوش فہمی کو یک لخت تار تار کر دیا تھا جسے میں نے گزشتہ کئی برسوں کے دوران سینے سے لگا کر بڑی محبت سے پروان چڑھایا تھا۔ یعنی اپنے بارے میں میرا یہ یقین محکم کہ منکہ ایک سمجھدار، ہونہار اور کامیاب ماں ہوں۔ اب جبکہ مامتا کے اظہار کا موقع آیا تو میں ایک بیٹے کے ہاتھوں بری طرح فیل ہو گئی تھی۔

مجھے اس عورت پر بہت رشک آ رہا تھا جس کو میں نہیں جانتی تھی۔ جس سے کبھی میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جسے دار فانی سے کوچ کیے ہوئے نہ جانے کتنا عرصہ گزر چکا تھا اور جس کی محبت ابھی تک اس لڑکے کے جسم و جاں کو گرمائے ہوئے تھی۔ وہ خوش قسمت عورت جو ایسے بیٹے کی ماں تھی، جس کی ذہنی سوچ عام لوگوں کی سوچ سے بالاتر تھی اور جس کا رویہ بھی عمومی رویے سے مختلف تھا۔ جو انسانیت کے درد سے آشنا تھا اور جسے آج کے مادی دور میں بھی رشتوں کی پہچان تھی۔

میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی پشت میری آنکھوں کے سامنے تھی اور وہ سر نیہوڑائے ہوئے آہستہ آہستہ ناک کی سیدھ میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں بآواز بلند سب کو بتاؤں کہ یہ جو غریب اور مسکین سا، پرانے اور میلے کپڑوں میں ملبوس لڑکا سر جھکائے ہوئے چلا جا رہا ہے، اسے غور سے دیکھو، اس کی قدر کرو، اس کا اجلا من جگر جگر کر کے اس کے میلے کپڑوں میں سے پھوٹ رہا ہے۔ اے بے خبر انسانو! اسے کمتر اور حقیر نہ جانو۔ اس کے اندر ایک بہت بڑا انسان دھونی رمائے بیٹھا ہے۔''

لیکن اس کے الفاظ جیسے میری قوت گویائی سلب کر چکے تھے۔ میں تو چاہتے ہوئے بھی اسے یہ دعا نہ دے سکی کہ۔

''پتر! تو نے میری مشکل آسان کی ہے جا اللہ دو جہانوں میں تیری ہر مشکل کو آسان کر دے اور سدا تیرا حامی و ناصر ہو۔''

معاً مجھے خیال آیا کہ میں نے اس سے اس کا نام بھی نہیں پوچھا۔ اب جب کبھی میں اس کے لیے دعا کیا کروں گی تو کیا نام لے کر کروں گی؟

میرے دل نے فوراً جواب دیا۔

''بھولی بنو! بھلا نام میں کیا رکھا ہے۔ دعا کو کسی نام، پتے اور ایڈریس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو جب بھی کی جاتی ہے، اور جیسے بھی کی جاتی ہے افلاک کا سینہ چیر کر فوراً اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہے۔ ہاں..... جب تم اس کو یاد کرنا چاہو تو اسے اپنے بیٹوں کا نام دے کر یاد کر لیا کرنا۔ اسے منیب کہہ کر پکارنا یا اسے محمد احمد کہہ کر پکارنا۔

گئے دنوں کا سراغ لے کر، کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ
بس ایک موتی سی چھب دکھا کر، بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر
ستارۂ شام بن کے آیا، برنگِ خوابِ سحر گیا وہ
خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم، نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں، میرے تو دل میں اتر گیا وہ

☆☆☆☆

فریحہ مبارک

قدموں کی خاک

ذرا ذرا سی بات پر میاں کو ناکوں چنے چبوانے اور بات بے باس اس کے بدھیا، بوریا انگر کھنگر کھاٹ کھٹولے کو گلی میں پھنکوا دینے کی دھمکی دینے والی روشن آرا بیگم آج اسی مرحوم میاں کی صحن میں دھری میت کے قدموں سے لپٹی ہوئی بین ڈال رہی ہے.....

ہائے..... میں مرجاؤں تو مجھے شبو کے ابا کی قبر کی پائنتی میں دفن کرنا! روز حشر ان کے قدموں کی خاک سے اٹھ کر خدا کو منہ دکھاؤں گی..... ہائے ربا! اب میں کس سے لڑوں گی! سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے ایک دلدوز چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئیں۔ عورتوں نے روشن آرا بیگم کو سنبھالا اور مرد شبو کے ابا کو آخری آرام گاہ لے جانے کے لیے روانہ ہوگئے۔

دراصل روشن آراء بیگم ہمارے معاشرے کے ان کرداروں میں سے ایک تھیں جو اپنی بات نیچی ہو جانے کے خوف سے ہمہ وقت دفاعی پوزیشن میں ہتھیار سنبھالے رکھتیں۔ ان کی عمر ستر کے پیٹے میں تھی لیکن ان کے تیور یہ بتاتے تھے کہ ''لاٹھی کو لاکھ گھن کھا جائے، ہنڈیا توڑنے کو کافی ہے۔''

زندگی بھر اختلافات کی راہ پر چلتے ہوئے بھی ان دونوں نے تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کے گھر آباد کرنے کا فریضہ ادا کر دیا تھا۔ قناعت، سادگی، رکھ رکھاؤ، میل جول، جہاں روشن آرام کے گن تھے تو وہیں ان کے طے کردہ اصولوں سے ذرہ بھر اختلاف کی صورت میں آواز اور لب و لہجے کا زیر و بم لمحوں میں نشیب سے فراز کی طرف چلا جاتا گویا بارود کے ڈھیر میں آگ کی چنگاری جا پڑی ہو۔ اور قرب و جوار میں موجود کوئی ذی روح اس کی تباہ کاری سے بچ نہ پاتا۔ ان کی زبان تو ایسی ریل گاڑی تھی جو رفتار پکڑ جائے تو لگام دینے کے لیے اس میں کوئی زنجیر نہ تھی۔ باقی تو سب کان دبا کر دائیں بائیں ہو جاتے ایک ان کے مسکین میاں تھے جو روشن آرا سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد بتدریج مسکین ہوتے چلے گئے۔ ان کی جاں بخشی اس وقت تک نہ ہو پاتی جب تک وہ سو تک گنتی اور پیر تک منتی نہ کر لیتے لیکن اب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی جورو کے غلام تھے، ان کے غصے کے اظہار کا اپنا ہی ایک انداز تھا اور وہ یہ کہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیگم کی چڑوں کو سوچتے اور ایک ہی دن میں کئی چڑوں کو چیلنج کر ڈالتے، مثلاً گیلا تولیہ صوفے پر ڈال دیتے۔ اخبار کا مطالعہ کر کے نہ صرف صفحات بکھیر دیتے بلکہ بیگم کا پسندیدہ صفحہ غائب بھی کر دیتے۔ پھر اچانک وہیں رکھ دیتے جہاں سے تلاش شروع ہوئی تھی الغرض بیگم سٹپٹا کر رہ جاتیں، نہانے جاتے تو صابن، تولیے اور کپڑوں کے لیے شور مچا دیتے جبکہ ہر چیز جگہ پر موجود پاتے۔ یوں بیگم کی جان جل جاتی اور میاں کے کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ جاتی۔

اکثر بحثا بحثی میں بیگم اپنے احسانات گنوانا نہ بھولتیں جو انہوں نے اپنے میاں کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے اور اولادوں کو پال پوس کر اس قابل بنا کر کیا تھا۔ جواباً میاں اپنی کارگزاریوں کی فہرست بیان کرتے تو یوں لپیٹ دیتیں۔

ہاں ہاں نام کیا شکر پارہ، روٹی کھائی دس بارہ، پانی پیا مٹکا سارا اور کام کرنے کو ننھا بچارہ۔ ان کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ تم تو نمازی بھی کھاٹ اور تین سو ساٹھ کے تھے۔ (کھاٹ کے یعنی صرف نماز جنازہ میں شریک ہونے والے، تین سو ساٹھ کے یعنی سال میں ایک بار نماز عید ادا کرنے والے) میں نے تمہیں آٹھ اور پھر ٹھاٹھ کا نمازی بنایا۔ (آٹھ کا نمازی یعنی آٹھ دن بعد جمعہ کی نماز اور ٹھاٹھ یعنی پانچوں وقت کا نمازی) میاں ان سب احسانات کے بدلے ایک ہی جملہ کہا

کرتے۔بیگم گڑ نہ دو..... پر گڑ کی سی بات تو کرو۔ یہ تمہاری روز روز کی کڑوی کسیلی سہہ سہہ کر میرا دماغ شل ہو چکا ہے اور تمہاری وقت بے وقت کی چیخ وپکار نے میرا سکون غارت کر دیا ہے۔ ذرا ان نعمتوں کو یاد کیا کرو جو اللہ رب العالمین نے ہمیں دی ہیں۔ کوئی ایسا دکھ نہیں دیا جو روگ بن کر جان کو لگ جائے۔ پھر کیوں ہر وقت شکوہ کناں رہتی ہو کیون زبان سے کلمہ شکر ادا نہیں کرتیں کیوں اپنے گھر کو گوشہ عافیت و سکون نہیں بننے دیتیں۔ کیوں ہر وقت جلتے ہوئے انگاروں پر لوٹتی رہتی ہو۔خود بھی وحشت زدہ دوسرے بھی پریشان!

بس اتنا سننا تھا کہ وہ میاں کے انگر کھنگر کھاٹ کھٹولے بدھیا بوریا کو گلی میں پھینکوا دینے کی دھمکیوں پر اتر آتیں۔مصلحت ومصالحت نام کی چڑیاں تو انہوں نے شادی کے سال بھر بعد ہی اڑا دی تھیں۔ بات دراصل یہ بھی تھی کہ ان کے میکے سے انہیں سبق ہی یہ ملا تھا اور وقت رخصتی بھی چپکے سے کسی نے کان میں بات ڈال دی جو دل تک اتر گئی کہ ''زبردست کی جوروسب کی دادی غریب کی جوروسب کی بھابی۔'' مگر شومئی قسمت میاں زبردست تو بالکل نہیں تھے غریب بھی نہیں البتہ مسکین ضرور تھے۔بس یہی غصہ ہر وقت ان کی ناک پر دھرا رہتا اور اولین طعنے میاں کو یہی سہنے پڑے کہ وہ زبردست کیوں نہیں ہیں بس اسی کی لپیٹ میں ان کا ہر اچھا کام بھی چیونٹیوں بھرا کباب قرار پاتا۔

ارے ارے سنبھالو روش آرا کو۔ ہوش آ رہا ہے۔

اے شبو کے ابا اچانک چلے گئے اپنی خطاؤں کی معافی بھی نہ مانگ سکی..... یا اللہ ایک بار انہیں واپس بھیج دے قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگوں گی..... ہائے خدمت کا موقع بھی نہیں دیا..... آخر کیا روگ تمہیں کھا گیا.....

عورتوں نے صبر کی تلقین کی تو نالے مزید بلند ہو گئے.....ارے اب صبر کہاں آئے گا..... مجھے بھی اپنے پاس بلا لو.....میرے جینے کا اب کوئی سبب نہیں رہا..... ہائے شبو کے ابا کی پائنتی میں دفن کرنا مجھے.....ان کے قدموں کی خاک سے اٹھ کر خدا کو منہ دکھاؤں گی!!

☆☆☆☆

نصرت یوسف

اِرحَمنِی

اس دن لگتا تھا کہ کرہ ارض کی بالائی تہہ میں سوراخ ہی سوراخ ہو گئے ہیں جن سے سورج کی شعاعیں بنا کسی رکاوٹ زمین پر اترتی اس کے جسم میں سوئیاں چبھو رہی ہیں۔ چہرے پر پسینے کو انگلیوں سے جھٹکتے اس نے بے اختیار آسمان پر نگاہ ڈالی۔ ابر کے کئی ٹکڑے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے جیسے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ تپش سے بے نیاز وہ دور دور اپنی اٹکھیلوں میں گم تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے اردگرد کے خوش باش لوگ، حالات کی تپش سے بے پرواہ اپنے جیسوں کے ساتھ اپنی دنیا اپنی ذات میں مگن..... اور ایک وہ ہے جو ان سے زندگی کی دھوپ میں سانس لینے کے لیے سایہ طلب کر رہا ہے مگر لگتا ہے کسی تک اس کی فریاد نہیں پہنچ رہی۔ اس کی آنکھیں گیلی ہونے لگیں تو بے اختیار اس نے ان کو مسل ڈالا۔

''سکندر کیا کرتا ہے دنیا کے سامنے روتا ہے۔''

ماں جی کی مہربان آواز جیسے قریب سے ہی آئی تو فوراً ہی اس نے وہ کتھئی رومال نکال کر چہرے پر پھیر لیا جو ماں جی کے انتقال کے بعد ان کے سامان سے بڑی حفاظت سے رکھا نکلا تھا۔ سکندر اس کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا، ابا جان کے آخری دنوں میں یہ بھی ان کے استعمال میں تھا۔ جسے اماں جی نے کسی خزانہ کی مانند سنبھال رکھا تھا۔ سکندر نے بے اختیار اسے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ کسی کو بھی اعتراض نہ ہوا، بھلا ماں جی کے طلائی کنگن کے آگے اس کپڑے کی دھجی کی کیا اوقات تھی۔ موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا، شیشم کی لکڑی اور لوہے سے بنے اس گیٹ پر سائرہ لاج کی منقش تختی لگی تھی۔ کچھ دیر قبل وہ اس گیٹ کو بڑی پرامید کیفیات کے ساتھ پار کر رہا تھا۔ دنیا پر اعتبار کرچی کرچی نہ ہوا تھا۔ انسان، خیر اور شر کے درمیانی رابطے بالکل واضح تھے مگر اب خیر اور شر کا تصور گڈمڈ ہو رہا تھا۔

''یارب! کیا تیری کائنات میں میرے جیسوں کی کوئی اہمیت نہیں۔'' موٹر سائیکل کو کک لگاتے ہوئے اس نے فریادی نگاہوں سے آسمان کو دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''نہ بادل سایہ دے رہے ہیں اور نہ بندے سہارا۔'' گرمیوں کا تپتا سورج اسے بے حال کر رہا تھا۔ مہینہ کی گیارہ تاریخ ہو چکی تھی اور صرف چار دن باقی تھے۔ اس کے بعد معاہدے کے مطابق دو لاکھ کی عدم ادائیگی پر اسے نہ صرف اپنے کاروبار سے محروم ہونا پڑتا بلکہ آغاز میں جو ساڑھے چھ لاکھ وہ ادا کر چکا تھا اس میں سے بھی دو لاکھ بطور جرمانہ منہا ہو کر اسے واپس ملتے۔ آئس کریم کا کام اس نے سال بھر قبل اپنی تمام تر امیدوں اور پرائز بانڈ میں ملی انعامی رقم لگا کر بڑی خوش گمانیوں کے ساتھ شروع کیا تھا۔ اس سے قبل وہ کسی کوریر کمپنی میں بظاہر آرام دہ جاب کر رہا تھا لیکن روز بروز آندھی طوفان کی طرح بڑھتی مہنگائی میں وہ جاب ماں جی اور اس کی بیوی بچوں پر مشتمل چند لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے ناکافی ہو چکی تھی۔ چھوٹے کے گوشت سے وہ بڑے گوشت اور پھر چکن تک چند سالوں ہی میں آن پہنچے تھے۔ خوردنی تیل کی بوتل کے بجائے تھیلی اور پھر کھلا مضر صحت تیل آنے لگا تھا۔ گھر روشن رہے یا نہ رہے کم از کم بتیاں جلائی جائیں تاکہ بل کا عفریت قابو میں رہے۔

لیکن ایسی اور تمام بچت کے باوجود گزشتہ سردیوں میں وہ دونوں بیٹوں کو ان کی پسند کے ہڈ والے سوئٹر لنڈے سے دلوا سکا تھا۔ ہاں بیٹی اور بیوی کو اس نے سستے نئے سوئٹر دلوا دیئے تھے۔ چائنا کے بنے ان ہلکے پھلکے سوئٹروں میں اسے اپنی بیوی کبھی کبھی کپکپاتی بھی لگی پھر آخر ایک دن دل کڑا کے اس نے اس کے لیے بھی لنڈے سے کسی کی اترن

لا دی۔ یہ وہ من موہنی سی شکل تھی جس نے شادی کی پہلی رات ملاقات ہی میں اپنا بنالیا تھا۔ نہ جانے وہ اتنی ہی اچھی تھی یا سکندر کو اس سے محبت ہو چلی تھی۔ بچوں سے محبت تو فطری طور پر والدین کے دل میں اتار دی گئی ہے لیکن میاں بیوی کے درمیان رابطہ اگر سمجھوتہ اور مجبوری کے نام کے بجائے انسیت اور محبت میں ڈھل جائے تو زندگی سے کئی شکوے کسی حد تک دھیمے پڑ جاتے ہیں۔ سکندر کو اپنے کاروبار پر راضی اس نے ہی کیا تھا۔ ورنہ کسی کی بلا سے سکندر کے بچے کس درجہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور کس درجہ کی زندگی گزار رہے ہیں۔

دونوں بڑے بھائی عرب ممالک میں ڈاکٹر تھے، دونوں کے بنگلے سال کے سال کچھ دنوں کے لیے آباد ہوتے اور ہفتہ پندرہ دن بعد جب وہ لوٹ جاتے تو پھر چوکیداروں اور ان کے کنبے کے قبضے میں آ جاتے۔ ان تینوں کی اکلوتی بہن سائرہ آپا بھی خاصی خوشحال بیگم صاحبہ تھیں۔ ان کے شوہر کاغذ کی ری سائیکلنگ کا بڑا اچھا کاروبار کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ پوری سیٹھانی بن چکی تھیں۔ لیکن بھائیوں کی نسبت وہ سکندر سے لگاوٹ سے ملتی تھیں۔

سکندر کے مقدر کا سکندر نہ بننے پر دونوں بھائیوں کو وہ بھی قصوروار لگتا تھا۔ حالانکہ ایک سکندر ہی کیا ملک میں کتنے ہی ایم بی اے کیے باصلاحیت دماغ حالات اور انسانوں کی ستم ظریف پالیسیوں کی چکی میں پس رہے تھے۔ سکندر نے تو ایسا کوئی دن نہ گزارا تھا جب ایم بی اے مکمل ہونے کے بعد اس کے پاس نوکری نہ ہو۔ ہاں اب زندگی کی سختیوں نے اس کو کسنا شروع کر دیا تھا۔ جب پانچ سال قبل اس کے دونوں بھائیوں نے ابا جان اور اماں جی والے آبائی گھر کو بیچنے کا شور مچا دیا۔ اس دن سکندر کو پہلی مرتبہ کبھی کا پڑھا شعر تڑامڑا سا یاد آیا۔

اگر محبت ہوتی خون کے رشتوں میں
تو یوسف نہ بکتے مصر کے بازاروں میں

بھائی بے شک یہ آپ لوگوں کا حق ہے لیکن میں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گا، میری بیوی بچے!! بھائیوں سے درخواست کرتے ہوئے وہ دلگرفتہ سا تھا۔

دیکھو سکندر یہ ہمارا کوئی ناجائز مطالبہ یا تم پر ظلم تو نہیں یہ تو ہمارا شرعی حق ہے۔ چھوٹے بھائی جان نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا تو سکندر کے اندر غصہ پھیلنے لگا لیکن بہت ضبط کے ساتھ اس نے بڑے بھائی کو بڑی آس سے دیکھا تو وہ پہلو بدل کر رہ گئے۔ شاید وہ خود خاموش رہنا اور برا نہ بننا چاہ رہے تھے۔

میں نے پراپرٹی ڈیلر سے بات کر لی ہے یہ گھر ایک کروڑ کا ہے، تمہارے حصے میں اٹھائیس لاکھ سے اوپر ہی رقم آئے گی۔ آرام سے تمہیں کوئی فلیٹ مل جائے گا۔

سکندر نے چہرہ گھما کر چھوٹے بھائی جی کا حساب کتاب سنا اور دونوں بازو باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب کچھ کہنا فضول تھا۔ بھائیوں نے حسب معمول پندرہ دن میں واپس چلے جانا تھا۔ سو ان پندرہ دن میں ہی چٹ پٹ سودا بھی ہو گیا۔ اور ایک ماہ کی مہلت گھر خالی کرنے کے لیے دے دی گئی۔ بڑے بھائی نے ائیر پورٹ روانگی سے قبل پانچ لاکھ کیش تھماتے یہ بتایا کہ دونوں بھائیوں کی طرف سے سال بھر کے لیے خرچہ۔ امید ہے کہ وہ اس رقم کو اپنے حصے کی رقم میں ملا کر کوئی بھی فلیٹ باآسانی حاصل کر لے گا۔ سکندر کی خودداری تو کہہ رہی تھی کہ وہ بھائیوں کے ایسے کسی احسان کا زیر بار نہ ہو جس کی بنیاد خودغرض فیصلوں پر تھی۔ ''کیا بھلا ہوا ان کا مجھے بے گھر کر کے! کچھ عرصہ رک جاتے، اور میرے قدم بھی جم جاتے تو میں خود اس گھر کی چابیاں ان کے حوالے کر دیتا۔ کاغذ کے یہ نوٹ ان کے اکاؤنٹ میں منتقل ہی تو ہوئے صرف مگر میرے لیے مسائل کا دروازہ کھل گیا۔ درد کی لہریں شائد اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی بڑے بھائی نے محسوس کر لی تھیں تبھی بے حد اصرار سے رقم اس کے ہاتھ تھما کر شاید ضمیر کا بوجھ کچھ ہلکا کرنا چاہا تھا۔

سب کچھ مل ملا کر بھی سکندر کو شہر کے معقول حصے میں ذاتی فلیٹ نہیں مل رہا تھا۔ ایسے میں اس کی بیوی شفق نے ایک روز بنا کہے سارا زیور سکندر کو تھما دیا۔ سکندر نے بڑے مان سے بیوی کو دیکھا اور زندگی

جو کچھ دنوں سے اجڑی اجڑی سی ہوگئی تھی ذرا سی مسکرانے لگی۔ اس نے تشکر آمیز نظر بیوی پر ڈالی اور دل نے غزل کا مصرعہ دہرایا.....

زندگی دھوپ تو گھنا سایہ.....

اور پھر مہلت کی مدت ختم ہوتے ہی وہ ایک کثیر منزلہ بلڈنگ میں منتقل ہوگئی۔ چوتھی منزل کا فلیٹ خاصی خراب حالت میں تھا۔ سکندر جیسے انسان کے لیے ایسی جگہ رہنا آزمائش تھا۔ لیکن اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ سائرہ آپا بھی گاہے گاہے بھائی کی خیریت دریافت کر لیتی تھیں۔ ورثہ میں ملنے والی رقم سے انہوں نے شہر کے مصروف کلب کی ممبرشپ حاصل کی تھی وہ آج کل پابندی سے وہاں اپنا حلقہ احباب وسیع کرنے جارہی تھیں۔ یہ دنیا ہی اور ہے..... وہ اکثر کلب کی رکنیت حاصل کرنے پر اپنے آپ کو سراہتی تھیں۔ نہ ابا جان کا گھر بکتا اور نہ مجھے یہ سب دیکھنے کو ملتا..... بڑے بھائی سے فون پر ان کا شکریہ ادا کرتے وہ بہت خوش تھیں۔ ہاں سکندر بھی مزے میں ہے..... مل گیا ہے اسے فلیٹ..... گئی تھی میں اس سے ملنے لیکن لفٹ خراب تھی چوتھی منزل اب بنا لفٹ کے میں تو نہیں جا سکتی۔ اس کا حوصلہ ہے جو اتنا اونچا فلیٹ اسی بلڈنگ میں لیا ہے جس کی لفٹ بھی آئے دن خراب رہتی ہے۔ سستا ملا ہوگا۔ ورنہ اور بہت اچھی جگہیں ہیں رہنے کیلئے۔

سائرہ آپا نے بڑے بھائی جان کو سکندر کے حال چال سناتے ہوئے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ کسی لان ایگزی بیشن سے آ کر وہ بہت تھکاوٹ محسوس کر رہی تھیں۔ رش بھی بہت تھا اور اے سی کی کولنگ بھی نہیں تھی۔ بس دو سوٹ بہ مشکل خرید کر وہ واپس آ گئیں۔ بند ہوتی آنکھوں کے پیچھے ان کو اپنی ماں جی یاد آ گئیں جو ساری زندگی اوسط درجہ کی خریداری کرتی رہیں تاکہ ان کے خوشحال میاں کو اپنے ضرورتمند عزیزوں پر خرچ کرنے میں دقت نہ ہو۔ سائرہ اور دونوں بھائی شعور کی دنیا میں قدم رکھتے ہی ان کے اس فلسفے سے چڑنے لگے تھے۔

ماں جی ہم سب کے ذمہ دار تو نہیں۔ ابا اچھا کماتے ہیں تو بھی آپ ہمیں اسی اسٹینڈرڈ سے رکھتی ہیں جیسے ہم یہ سب چیزیں افورڈ نہیں کر سکتے۔ بھائی نے گھر میں برازیل کے کرسٹل کے فانوس لگانے کی مخالفت پر ماں سے تنک کر کہا تھا۔

بیٹا جی فانوس تم اس لیے لگا رہے ہو کہ شان میں اضافہ ہو تو میرا یقین ہے فانوس ان انسانوں کی شان میں کوئی بھی اضافہ نہیں کر سکتے جن کے اردگرد کے انسان کتنی ہی اہم ترین ضروریات کے لیے ان کی مدد کے محتاج ہوں اور وہ ان کے چہروں پر پھیلتی بے بسی اپنے گھر کے جلتے فانوسوں کی روشنی میں دیکھ نہ پائیں۔ عزت اور شان بڑھانے والی ذات بیٹا وہ ہے یہ چیزیں نہیں جن کے لیے ہمارا نفس مچلتا ہے۔

ماں جی کی انگلی اوپر اٹھانا سائرہ آپا کو آج تک پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ اس میں پہنی وہ سونے کی خوبصورت انگوٹھی جو ابا جی نے ان کو رونمائی میں دی تھی۔ مخروطی انگلیوں کے ناخنوں پر مہندی لگی تھی۔

اماں جی آپ کو نہیں ہے ان چیزوں کا شوق لیکن ہمیں تو ہے۔ آپ ہمیں نہ روکا کریں۔ اپنے قد سے اونچے ہوتے بیٹوں کے اعتراضات سن کر وہ خاموش ہوگئی تھیں۔ اور پھر یہ انہوں نے اپنا وطیرہ ہی بنا لیا۔ اپنی رائے کا اظہار کرنے کے بعد وہ چپ ہو جاتیں اور گھر کا نظام بالکل مختلف طرز پر رواں ہوگیا۔ ابا جی کو نہ پہلے اعتراض تھا اور نہ اب۔ بلکہ یوں لگتا تھا کہ ابا جی کے ہاتھوں ہونے والی خیر کا بیشتر حصہ ماں جی کا پس پردہ وجود تھا۔ وہ اتنی طاقتور نہ رہیں تو ابا جی کے مددگیری کرتے ہاتھ بھی نمایاں نہ رہے۔

سکندر کے دسویں جماعت میں پہنچنے تک تینوں بڑے بھائی بہن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ دونوں بھائی قسمت کے دھنی نکلے۔ ہاؤس جاب کے فوراً بعد ہی شہر کے معروف ہسپتال میں نوکری مل گئی اور پھر چند سالوں ہی میں یکے بعد دیگرے عرب ممالک چلے گئے۔ وہاں کی نوکری نے وارے نیارے کر دیئے۔ تو زندگی کے بارے میں ان کا نقطہ نظر ماں جی سے مزید مختلف ہوگیا۔ سائرہ آپا بھی اپنے سسرال میں خوش باش تھیں۔ ماں جی کے فلسفہ سے آزاد من چاہا کھاتیں، من چاہا خریدتیں، اپنی بیٹی اسما کو خریداری کراتے یہ جملہ ان کی زبان پر اکثر آ جاتا۔

خوش قسمت ہو جو اپنی مرضی سے جو چاہتی ہو، خرید کر دیتی ہوں میں، ہمیں اس طرح کی آزادی نہیں تھی۔

نہ جانے وہ بیٹی کو اپنا قدر دان بنانا چاہ رہی تھیں یا ماں سے غائبانہ شکوہ کرتی تھیں مگر مہنگی چیزوں کی خریداری کے کچھ دنوں بعد اسے ناقدری سے ادھر ادھر رلتا دیکھ کر انہیں دکھ سا ہوتا۔ جو کہ محض وقتی ہوتا اگلی مرتبہ سب کچھ بھول بھال وہ اسی طرح خرچ کر رہی ہوتیں کہ نہ وقت کی کمی تھی نہ نوٹوں کی۔

سکندر کے بی اے کرنے تک ابا جی کا لیدر جیکٹ کا کام عمدگی سے رواں رہا۔ اس کے بعد بین الاقوامی پالیسیوں کے باعث اس پر بھی زوال آ گیا۔ جس کے اثرات ابا جی کی صحت سے لے کر گھر کے در و دیوار تک میں اتر آئے تھے۔ اب کے دونوں بڑے بھائی وطن آئے تو اپنے خریدے گئے گھروں میں قیام کیا۔ مٹے مٹے رنگ روپ والے آبائی مکان میں دونوں کے گھر والوں کو وحشت سی ہوتی تھی۔ ابا جی کو بھی شاید یہ اجڑا اجڑا آشیانہ پسند نہ آنا تھا تب ہی وہ دوسری دنیا کو کوچ کر گئے۔

ابا جی کے جدا ہوتے ہی ماں جی نے سکندر کے ایم بی اے مکمل ہونے اور معاشی طور پر مضبوط ہونے کا انتظار کیے بغیر ہی اس کی نسبت اپنی جان پہچان والوں میں طے کر دی۔ اب ان کے گھر کوئی ہوت نہ تھی جو جوت جلائی جاتی سو دونوں بڑے بھائیوں اور بہن کی نسبت سکندر کا رشتہ ایک اوسط درجہ کے گھر میں ہی انہوں نے کیا۔ سکندر نہ اس رشتہ پر خوش تھا اور نہ اس مرحلہ پر اس جھمیلے سے راضی..... اس نے اپنی زندگی کے لیے جو اہداف مقرر کیے تھے ان میں جلد شادی صرف اس صورت ممکن تھی جب وہ معاشی طور پر مستحکم ہو جاتا۔ ابھی تو پڑھائی اور گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ابا کا چھوڑا بچا کھچا کاروبار ایک ساتھ نمٹانا ہی وقت طلب کام تھا۔ انہی حالات میں ابھی سال ہی گزرا تھا کہ عمارت جس میں ابا جی کا کام تھا شارٹ سرکٹ کی وجہ سے خاکستر ہو گئی۔

بظاہر یہ منفی حالات تھے لیکن سکندر اور ماں جی حق میں اس طرح خیر بن گئے کہ دونوں بڑے بیٹوں نے اخراجات کی مد میں رقم بھیجنا شروع کر دی۔ سکندر نے ایم بی اے کا بقیہ حصہ پوری یکسوئی سے تعلیم پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے گزارا۔ اس کے دوست کے والد شہر کے مشہور آئس کریم پلانٹ کے مالک تھے۔ اس دوست کی محبت میں سکندر کو اس کام کے بارے کچھ شد بد ہو چکی تھی۔ دوست اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ لیکن ملک سے باہر جانا چاہتا تھا۔ سو بزنس کے سوا کچھ ایسے ''ٹپس'' بھی بلا تکلف سکندر سے شیئر کر لیتا جو عمومی حالات میں وہ کسی سے نہ کہتا۔ اس نے سکندر کو بارہا اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر سکندر جانتا تھا کہ اوپر سے قائم کیے بھرم کے نیچے حالات ایسے نہیں کہ وہ کسی بھی پیمانے پر دوست کی بات مان سکے۔ سو ہمیشہ وہ ٹال جاتا اور پھر ایم بی اے مکمل ہوتے ہی اسے اچھی بھلی نوکری بھی مل گئی۔

نوکری کی خبر نے جیسے دونوں بڑے بھائیوں کو سکون کا احساس بخش دیا اور پہلی تنخواہ کے ساتھ ہی بھائیوں کے پر جوش مبارکبادی کے فون آئے تو سکندر کا جیسے اپنے اوپر اعتماد سوا ہو گیا۔ نہ جانے اماں جی کے چہرے پر یاسیت کی لہر ابھرتی کیوں نظر آتی ہے۔ شاید بھائیوں کی طرف سے رقم کا سلسلہ بند ہونے کی بنا پر وہ اپنے مزاج کے مطابق دوسروں کی مدد نہیں کر پا رہیں۔ جو ان کے لیے ناخوشگوار ہے..... ماں کی کیفیت بغور جانچ کر اپنے طور نتیجہ اخذ کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کی تنخواہ اس درجہ کی نہیں جس طرز زندگی کا وہ عادی ہے۔

اماں جی آپ دیکھیے گا بہت جلد مجھے اس سے بہتر کام ملے گا۔ اس نے بڑے لاڈ سے ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹتے ہوئے کہا تو زیر لب دعائیں پڑھتی ماں نے بیٹے کی پیشانی چوم لی۔

بس آپ خوش رہا کریں، میں بہت جلد اس گھر میں مرمت شروع کرا دونگا۔

اور پھر میں نے تمہاری شادی کی تقریبات..... ماں جی نے سکندر کے ارادوں کے درمیان اپنے ارادے ظاہر کرنے شروع کیے تو وہ منہ بنانے لگا۔ اماں جی اس کی شکل دیکھ کر ہنس پڑیں۔

اور اس گھر پر اپنے خون پسینے کا پیسہ لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ گھر اب تمہارے باپ کا نہیں بلکہ ان کے تمام وارثوں کا ہے اور ان

کے وارث بہت جلد اپنا حق لینے موجود ہوں گے۔

ماں جی نے سامنے رکھی ہوئی لکڑی کی بھاری کرسی کو ایسے دیکھا جیسے ان کے میاں جی اس میں بیٹھے ہوں۔ سکندر نے ماں کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا اور ان کے الفاظ اس کے دماغ سے ادھر ادھر کہیں گم ہو گئے۔ اسے بھی ابا جی یاد آنے لگے تھے۔ کیسے لاڈ سے وہ اسے میرا شہزادہ کہا کرتے تھے۔ ابا جی نے کیسے شوق سے اپنے شہزادہ کیلئے کتنا بڑا فش ایکویریم گھر میں منگوایا تھا۔ جو رنگ برنگی تیرتی مچھلیوں کے گھر کے بجائے اب گھر کے پچھواڑے میں کاٹھ کباڑ ہوا پڑا تھا۔ گھر صحیح کراتے ہوئے میں اس ایکویریم کو بھی ٹھیک کراؤنگا۔ سکندر کی سوچ ابھی بھی وہیں اٹکی تھی جہاں ماں جی کی نگاہیں ٹکی تھیں۔ ان کی نصیحت وہ سمجھ ہی نہ پایا تھا۔ جبکہ وہ آنے والے وقت کو اپنی اولاد کی چاپوں کو بخوبی محسوس کر رہی تھیں۔ جن سے سکندر ناآشنا بھی تھا اور لاعلم بھی۔

کچھ ہی عرصہ بعد سکندر کو ایک مختلف جگہ نوکری مل گئی کوریئر کمپنی کی جاب آرام دہ بھی تھی اور تنخواہ میں نسبتاً زیادہ اب اس نے ابا کے وقت کی پرانی گاڑی بیچ کر نئی گاڑی لینے کا ارادہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ اماں کے گھر میں پرانے مکینوں کے ساتھ نیا مکین لانے کا فیصلہ سکندر کو جز بز کر گیا۔

ماں جی ابھی گھر کو ٹھیک ٹھاک کرانا ہے۔ کچھ عرصے کے لیے بھول جایئے شادی وادی کو..... وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔ مگر شاید اس کی جھنجھلاہٹ میں ماں کو اپنے لیے مان بڑا واضح لگتا تھا اس لیے وہ اپنی رائے اس کی پسند پر حاوی کر دیتیں اور وہ کبھی خاموش اور کبھی روٹھا روٹھا سا انداز لیے ان کی مان جاتا۔ اور یوں چند ماہ بعد ہی شفق اس گھر کی نئی مکین بن کر سکندر کی زندگی میں آ گئی۔ آپا سائرہ اور دونوں بھائیوں نے ماں جی سے اشاروں کنایوں میں ابا جی کے گھر کے متعلق ایک دو مرتبہ بات چھیڑنا چاہی لیکن وہ انجان بنتے موضوع کو ٹال گئیں۔ سکندر کو بھی کسی بھائی بہن سے بدظن کرنے کے بجائے انہوں نے بڑی حکمت سے گھر کی تزئین و آرائش پر پیسہ لگانے سے روکا تھا۔ اور اپنے طور وہ گھر کے بٹوارے کو موثر کرنے کی کوشش میں تھیں۔ ان کے دونوں بڑے بیٹے اچھے خاصے خوشحال اور اپنی جگہ مضبوط تھے۔ بیٹی بھی آرام دہ زندگی گزار رہی تھی سو گھر اگر مزید کئی سال بھی نہ بکتا تو کسی کے ساتھ ناانصافی نہ تھی جبکہ بکنے کی صورت میں محض سکندر اور وہ خود حالات کے تھپیڑے کھاتے۔ دونوں بڑے بیٹوں کے قدم جمنے تک اس گھر میں ماں باپ کے سائے میں فیض اٹھایا تھا۔ اب کچھ عرصہ اور اگر سکندر بھی مستفیض ہو جاتا تو یہ ان کے رشتے کا تقاضا تھا کہ وہ بخوشی آمادہ ہو جائیں۔ بظاہر دل کی یہ گنجائش رکھتے تینوں ہی دکھائی نہ دے رہے تھے یہ بھی شکر تھا کہ ماں کے توجہ نہ دینے پر وہ کھل کر نہ بولے اور پھر پورے سات سال وہ چپ ہی رہے۔

ماں جی کی زندگی نے سکندر کو گھر کے معاملہ میں بڑی ہی عافیت میں رکھا۔ تین بچوں کے ساتھ اور کئی جوڑ توڑ اخراجات کے معاملہ میں وہ شفق کرتے رہے لیکن کوئی بھونچال نہ آیا۔ آیا تو ماں جی کے انتقال کے ہفتہ بھر بعد جب دونوں بھائیوں نے گھر بیچنے کی بات سنا دی اور وہ بھرم جو سکندر کا دنیا پر قائم تھا وہ ورثہ ترکہ کی تقسیم میں آ کر یکسر ختم ہو گیا۔ دنیا اسے چھوڑ کر اب دونوں بڑے بھائیوں اور سائرہ آپا ہی سے تعلق رکھنے میں خوش رہتی اور.....سکندر وہ کہیں گم ہو چلا تھا.....ان کے لیے بھی جو کبھی اس کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے تھے اور ان کے لیے بھی جو ان کے زیر دست رہ چکے تھے۔ مگر اب اتنے اونچے اٹھ گئے تھے کہ نیچے رہ جانے والوں پر نظر جمتی ہی نہ تھی۔ سکندر وقت کی مرتب کرتا کتاب باب در باب پڑھتا تو تلخ ہونے لگتا۔ ایسے میں شفق اس کو نوکری چھوڑ کر کاروبار میں قسمت آزمانے کا مشورہ دیتی۔ جیب میں نہیں دانے سیاں چلے بھنانے..... وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے کر ہمیشہ بات ختم کر دیتا۔

وہ ایک عام سی شام تھی، دونوں بیٹے کچھ دیر قبل ہی گھر سے باہر کھیل کھود کے لیے نکلے تھے بیٹی بھی پڑوس میں رہنے والی ہم عمر بچی کے گھر گئی تھی ایسے میں شفق نے سکندر کی گھر آمد کے بعد چائے دیتے ہوئے ایک بار پھر یہ ہی بات چھیڑ دی۔

میں آج جلدی گھر اس لیے آیا تھا کہ تھکان بہت محسوس ہو رہی

تھی۔مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ آفس کے باس نے تو مہربانی کر دی لیکن گھر میں اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔

چائے کا کپ سکندر نے باقاعدہ بیٹھتے ہوئے بیوی کو گھورا اور بستر پر لیٹ گیا۔شفق نے ہکا بکا ہو کر میاں کا غصہ سہا، اور دھیرے سے ماتھا چھوا تو حرارت محسوس ہوئی اس کا دل مسوس گیا، ناحق بات کی مجھے کیا معلوم تھا کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

منتشر ذہن کے ساتھ اس نے توجہ ہٹانے کے لیے میاں کا لایا اخبار پڑھنے کے لیے اٹھا لیا۔مگر لاحاصل! وہ ایسے ہی صفحے پلٹ رہی تھی۔آج بھی ہمیشہ کی طرح بچوں کو سکول ہوم ورک کراتے اسے سخت کوفت ہو چلی تھی۔اسکول کی علمیت بچوں کو رٹو طوطے بنا رہی تھی۔یاد کرنے کے بوجھ نے بچے کے جاننے کے شوق کو بالکل ختم کر رکھا تھا۔میرے بچے شہر کے معیاری سکول میں پڑھتے تو یہ سب لایعنی باتیں تو نہ ہوتیں۔اس نے کڑھ کر ہمیشہ کی طرح سوچا، خود وہ کانوینٹ سے میٹرک کر کے بی ایس سی تک کوئی پوزیشن ہولڈر نہ تھی لیکن پڑھا گیا تمام مواد اپنے معنی کے ساتھ محفوظ تھا۔کہیں وہ اٹکی نہ تھی۔رواں اور سہل طریقے سے سمجھاتے ہوئے اپنی اولاد کو رٹنے پر مائل دیکھ کر اسے سخت جھنجھلاہٹ ہوتی۔لیکن اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔اگر وہ ایسا نہ کرے تو پھر اس کی سزا بھگتتے جیسا بیٹی مونا کے ساتھ ہوا۔اس نے ٹیچر کے لکھے جواب کے بجائے اپنی سمجھ سے جواب لکھا تو اس کو اتنا ستایا گیا کہ وہ اگلے دن ماں سے سمجھنے کے بجائے محض رٹا لگانے کو تیار تھی۔ایسے میں شفق کو وسائل کی قلت کا شدید ترین قلق ہوتا۔کاش میں اپنے بچوں کو بہتر تعلیم مہیا کر سکتی یہاں تو صرف یہ کلرک، ہی بن سکتے ہیں یوں سکندر کے آفس میں سے گھر آنے کے بعد اس نے بچوں کی غیر موجودگی کو غنیمت جانتے ہوئے اس نے بات شروع کی۔اور پھر دونوں میں خوامخواہ بدمزگی ہو گئی سکندر کی بات درست تھی۔شفق محض جذباتی ہو رہی تھی لیکن بچوں کے مستقبل کا خیال اسے جذبات سے فیصلہ کرانے پر مجبور کر رہا تھا۔

اور پھر ایسے ہی غائب دماغی سے اخبار کے صفحات پلٹتے اسے پرائز بونڈز کی قرعہ اندازی کی فہرست دکھائی دی کاش اور کچھ نہیں تو صرف پانچ لاکھ کا ہی انعام نکل آئے۔اس نے نمبروں کو گھورتے سوچا اور تیزی سے اٹھ کر سالوں سے رکھا بونڈ نکال لائی اور پھر صرف پانچ منٹ بعد جب واقعی پانچ لاکھ کے انعام میں اس نے اپنے پاس موجود بونڈ کا نمبر پایا تو وہ گنگ ہو گئی۔شاید قسمت مذاق کر رہی ہو اس نے سہمتے ہوئے پورے تین مرتبہ نمبر کو چیک کیا۔پھر کچھ وقفہ کے بعد تین مرتبہ اور مگر ہر مرتبہ اخبار میں چھپا اور اس کے پاس موجود بونڈ نمبر ایک ہی تھا۔جسم میں پھیلتی سنسناہٹ پر قابو پاتے ہوئے اس نے سکندر کو دیکھا جو کچھ دور صوفہ پر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔تھکان اس کے چہرے پر اتر آئی تھی۔حالات کی سختی کے اثرات اس کی وجاہت پر اثر انداز ہو چکے تھے۔اس نے سکندر کا پیر ہلایا.....اٹھیے پانچ لاکھ سے اپنا کاروبار شروع کیجیے.....سادا سا جملہ بولتے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو چلی تھیں۔سکندر نے نیم وا آنکھوں سے بیوی کو دیکھا.....جس کی سنہری رنگت ماند پڑتی جا رہی تھی.....اس نے اس کے جملے کو محض ایک مذاق سمجھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

اب آنکھیں کھولنے کا وقت آ چکا ہے.....سکندر! یہ پورے پانچ لاکھ کا انعام نکلا ہے ہمارے بونڈ پر.....شفق نے بونڈ اور اخبار دونوں لہرائے تو وہ بجلی کی تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور یوں کاروبار کیلئے پانچ لاکھ کا قلیل ترین سرمایہ لے کر وہ اچھی قسمت کی دعائیں مانگتا اس میدان میں اترا تھا۔آئس کریم کے کام سے آگاہی کی بنا پر ہی وہ بہ آسانی آغاز کر سکا۔کچھ نپا تلا سرمایہ اور کچھ سال بھر کی میعاد پر قرضہ اس کی ابتدا تھی۔قسمت کی مہربانی سے آئس کریم کی ایک چھوٹی سی دکان اسے تمام سیٹ اپ کے ساتھ مل گئی تھی۔

ایک سال گزر چکا تھا معاہدے کے مطابق اس سیٹ اپ کے مالک کو محض 2 لاکھ کی ادائیگی باقی رہ گئی تھی۔پورا سال اس نے بڑے حوصلہ کے ساتھ بے انتہا سخت حالات میں گزارا کر کے قسطوں میں اسے وقتاً فوقتاً رقم ادا کی تھی۔بس اب معاملہ محض دو لاکھ کا تھا۔اگر یہ مل جاتے تو آسمان کی دھنک اسے بھی دھنک لگتی ورنہ زندگی کس درجہ پر پہنچ جائے گی اس کا تصور کرتے بھی آبدیدہ ہونے لگتا۔کوئی نہ جانتا تھا کہ رقم کی

ادائیگی کیلئے اس نے اپنے بیوی بچوں سمیت کتنا کم کھایا اور کس طرح کا پہنا۔شفق نے بھی قریب میں واقع کسی سینٹر میں کٹنگ سکھانی شروع کردی تھی۔شوق شوق میں شادی سے قبل لی گئی کوکنگ کلاسز کے آخر میں ملا سرٹیفکیٹ ایسے میں بڑا ہی کام آیا اور بچوں کے سکول اخراجات کا پچاس فیصد وہ نکالنے کے قابل ہوگئی۔گھر سے باہر نکل کر کام کرنے میں گھر بڑا ہی متاثر ہوا۔اپنے گھر کی صفائی کے اوقات میں وہ نکل جاتی اور بچوں کے سکول سے گھر لوٹنے سے پہلے اسے واپس آنا ہوتا تھا۔وہ کسی کو بچیوں کے گھر میں ماں کے بنا ہونے کا تاثر بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔عمارت میں ہر ذہنیت کے لوگ بستے تھے اس کی گیارہ سال کی بیٹی کا تیزی سے لمبا ہوتا قد نگاہوں کو متوجہ کرتا تھا۔سکول پڑھائی کے معاملے میں ماڈرن تو نہ تھا لیکن لڑکیوں کو جدید انداز کا پہناوا ضرور آجانا تھا۔

صبح دس بجے سے دوپہر ڈھائی تک کام کر کے وہ پونے تین تک گھر پہنچ جایا کرتی تھی۔کہنے کو اس کا تقرر کوکنگ کے لیے ہوا تھا لیکن پھر اسے سلائی کی ٹیچر کے ساتھ بھی لگا دیا گیا۔اس کا کام ان کی مدد کرنا تھا۔سلائی اسے نہ آتی تھی بھلا وہ ان کی کیا مدد کرتی لیکن عجیب انتظامیہ تھی،سلائی کی دو ٹیچرز کی ضرورت تھی جسے وہ ایک ٹیچر کے ساتھ شفق کو ملا کر محض گنتی پوری کر رہے تھے۔گویا اناڑی رکھ کر کھلاڑی کی مہارت کے پیسے سیکھنے والوں سے بٹور رہے تھے۔اور یہ مضحکہ خیز حقیقت صرف اس چھوٹے سے غیر معروف ادارے میں ہی نہ تھی بلکہ ہر سطح پر بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ پائی جاتی ہے۔مٹی کے کچے گھڑے جیسے ارزاں انسانوں کو فنکار کا تراشیدہ عمدہ نمونہ دکھانے کیلئے سطحی لیپا پوتی کر کے پیش کر دیا جاتا ہے۔جنہیں دریا میں اتار دیا جائے تو سوہنی ڈوب ہی جاتی ہے۔

شفق کی بھی ایسی لیپا پوتی کر کے اسے سلائی کی ٹیچر بھی ظاہر کر دیا گیا۔لڑکیوں کو پیسہ ڈوبتا ہی لگتا اگر انہیں دوستانہ انداز لیے شفق نہ بھا جاتی جو سخت گیر دوسری استانی کے مقابلے میں ان کی بات یا کام کو طنز میں نہ اڑاتی وہ تو کسی درجہ میں بھی ایسا رویہ نہ رکھ سکتی تھی۔بھلا اسے کچھ آتا ہی کب تھا۔ہاں یہاں رہتے وہ سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔اصلی ٹیچر ایک نمونہ کی کٹنگ کرتی اور باقی لڑکیوں کو شفق کے حوالے کر کے کہتی کہ اب اس کو ان کے پاس موجود کپڑے پر رکھ کر کٹنگ کر دو۔یا مارک لگائے حصہ پر بخیہ چلا دو۔بس ایسے ہی کام سلائی ٹیچر شفق کے ذمہ تھے۔کسی کا بھلا ہوا یا نہیں شفق کو سلائی کی شد بد ہو چلی تھی۔ورنہ اس سے پہلے سوئی دھاگہ اور قینچی سے اس کا تعلق معمولی طور پر ادھڑے کو سینا یا ٹانکا لگانے کی حد تک تھا۔

کبھی باورچن تو کبھی درزن کا کردار ادا کر کے جب وہ گھر پہنچتی تو بچے اکثر ہی اسے گھر کے دروازے کے باہر انتظار کرتے ملتے۔وہ چاہتی تو بیٹی کو چابی بھی دے سکتی تھی لیکن پھر وہی بات کسی کو بھی بچوں کی گھر میں ماں کے بغیر موجودگی سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

پورا سال اس مشقت میں دونوں میاں بیوی کے ساتھ بچوں نے بھی اچھے دنوں کی آس میں گزارا تھا کہ جب قرضہ اتر جائے گا اور وہ روکھی پھیکی کے بجائے وہ کھانا کھا سکیں گے جس کے وہ عادی تھے ایسا کھانا وہ اگر اب کھاتے تو قرضہ کے لیے جمع کرنے والی رقم میں کمی ہو جاتی۔پورا سال انہوں نے تین کمروں کے فلیٹ میں محض ایک ٹیوب لائٹ جلائی،ہاتھ منہ دھونے کیلئے گھٹیا ترین صابن استعمال کیا جس سے اس کے بیٹے باسط کی جلد میں سخت خارش رہنے لگی تو وہ سسک پڑی۔لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اس نے سوچا بس کچھ ہی عرصہ کی بات ہے یہ قرضہ اتر جائے تو کچھ آسودگی نصیب ہوگی۔سکندر نے شفق کو ذہنی تناؤ سے کسی حد تک محفوظ رکھنے کیلئے اسے قرض کی اصلی رقم نہ بتائی تھی۔وہ پرامید تھا کہ اگر وہ اتنی رقم جمع نہ کر سکا تو اس کے ساتھ خوشحال عزیزوں رشتہ داروں سے مل ہی جائے گی۔بے شک ایسا کرنے میں رہا سہا بھرم بھی ختم ہو جاتا لیکن اس کا کام بن جائے گا۔

کتنے ہی متوقع سوالات کے جوابات سوچتا جب وہ بھائی ذکا کے پاس پہنچا تا کہ ان سے رقم مانگ سکے تو وہ اپنے نئے ماڈل کے مہنگے ترین موبائل فون پر فرنیچر والے سے مصروف تھے۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆

سفارش

محلے کی بڑی گلی کے موڑ پر تین چار تانگے ہر وقت موجود رہتے ہیں مگر اس روز میں موڑ پر آیا تو وہاں ایک بھی تانگا نہیں تھا۔ مجھے خاصی دور جانا تھا اور جلد بھی پہنچنا تھا۔ اس لیے تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ تانگے تو بہت سے گزرے مگر سب لگے ہوئے تھے۔ اچانک میں نے فیکے کوچوان کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پکارا۔ ''بھئی فیکے .....تانگا کہاں ہے؟ تانگا لاؤ نا۔''

''تانگا تو بابو جی! آج نہیں جوڑا ہے۔'' فیکے نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ فیکا جو کوچوان کا کوچوان اور پہلوان کا پہلوان تھا، آج اتنا معصوم لگ رہا تھا جیسے پہلی جماعت میں داخلہ لینے آیا ہے۔ اس نے آج شیو بھی نہیں بنوایا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سرمے سے محروم تھیں اور بوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

''کیا بات ہے فیکے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''بابو جی، ایک کام ہے۔''

''ہاں ہاں کہو۔'' میں نے کہا۔

''کام یہ ہے بابو جی کہ آپ میرے بابا کو تو جانتے ہیں نا؟'' فیکا بولا۔ ''اس کی ایک آنکھ چلی گئی ہے۔''

''اوہو۔'' مجھے دکھ ہوا۔ ''کیسے گئی؟ کیا کوئی حادثہ ہوا؟''

''جی نہیں'' فیکے کے چہرے پر بھولپن کا ایک اور چھینٹا پڑ گیا۔

''لال لال تو وہ ہر وقت رہتی تھی اور اس میں سے پانی بہتا رہتا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں، آپ تو بابا کے ساتھ کئی بار تانگے پر بیٹھے ہیں۔ تو بابو جی کل کیا ہوا کہ بابا مصری شاہ میں سے گزرا تو سانڈے کا تیل بیچنے والا ایک حکیم سرمہ بیچ رہا تھا۔ بابا یہ سرمہ لے آیا اور ہمیں بتایا کہ اس سے آنکھ کی لالی جاتی رہے گی۔ حکیم نے خدا رسول کی قسم کھا کے کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ نہ جائے تو قیامت کے دن مجھے گردن سے پکڑنا۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ حکیم خدا رسول کو بیچ میں ڈال رہا ہے تو ذرا سا لگا لے۔ اماں نے بھی یہی صلاح دی۔ اس نے ''لقمان حکیم، حکمت کا بادشاہ'' پڑھا اور آنکھ میں سلائی پھیر لی۔ بس پھر کیا تھا بابو جی قسم کھا کر کہتا ہوں جب سے اب تک آنکھ لگی ہو تو اپنے باپ کا نہیں۔ بابو جی، آپ تھک تو نہیں گئے؟ سگریٹ والے کی کرسی اٹھا لاؤں؟''

اس وقت فیکا مجھے ایسے لگا جیسے اس کے چوڑے چکلے سینے پر گڈے کا حیران سر رکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ ''تم بھی حد کرتے ہو فیکے، اب آگے بھی کہو!''

فیکے کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگی وہ بولا۔ ''بس بابو جی خدا آپ کا بھلا کرے رات تو چیخ چاخ کے گزار دی پھر صبح کو محلے کے سارے کوچوان اکٹھے ہوئے تو ان میں سے چچا شیدے نے کہا کہ پوسٹ کے ڈوڈے پانی میں ابالو اور اسی پانی سے آنکھ دھوؤ، دھونے پر بابا اسی طرح تڑپتا رہا۔ پھر کسی نے کہا کہ پالک کا ساگ ابال کر باندھو، باندھا اور جب کھولا تو بابا نے صاف کہہ دیا کہ اب کیا جتن کرتے ہو آنکھ کا دیا تو بجھ گیا۔ ہمارے گھر میں تو پٹس پڑ گئی بابو جی۔ اسے ایک ہسپتال میں لے گئے۔ پھر دوسرے میں لے گئے۔ دونوں میں جگہ نہ تھی۔ دوپہر کو راج گڑھ کے ایک کوچوان نے بتایا کہ اس کا سالا میو ہسپتال میں چوکیدار ہے۔ اس کی سفارش سے جگہ تو مل گئی پر برانڈے میں۔ وہ بھی کوئی ایسی بات نہیں پر بابو جی شام ہونے کو آئی ہے اور ابھی تک کوئی ڈاکٹر تو کیا نرس بھی ادھر نہیں آئی۔ آپ صاحب لوگ ہیں یہ دیکھیے ہاتھ باندھتا ہوں میرے ساتھ چل کر کسی ڈاکٹر سے یہ کہہ دیجیے کہ صدیقے مریض کو ذرا دیکھ لے۔''

میں نے کہا۔ ''وہاں ایک ڈاکٹر ہے ڈاکٹر عبدالجبار۔ ان سے میرا سلام کہو کام ہو جائے گا۔ نہ ہوا تو کل میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اس وقت مجھے ایک دعوت میں جانا ہے۔ نام یاد کر لو ڈاکٹر عبدالجبار۔''

فیکا میرے بہت سے شکریے ادا کر کے چلا گیا۔ پھر مجھے ایک خالی ٹانگا مل گیا۔ جب ٹانگا میو ہسپتال کے صدر دروازے کے سامنے سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ فیکا ہسپتال کے ایک چوکیدار سے باتیں کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر جبار کا پتہ پوچھ رہا ہو گا۔ ایک بار جی میں آئی کہ ہسپتال جا کر جبار صاحب سے کہہ دوں مگر اب ٹانگا آگے نکل گیا تھا اور مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔

کچھ دور جا کر گھوڑا پھسل کر گرا۔ اور دس منٹ تک گرا رہا۔ پھر جب اٹھا اور چلنے لگا تو یکا یک جبار صاحب کا سکوٹر میرے ٹانگے کے قریب سے زن سے گزر گیا۔ جبار صاحب! میں چلایا۔ مگر جبار صاحب میری آواز سے تیز نکلے۔

کوئی بات نہیں، میں نے سوچا، کل کہہ دوں گا۔ کل پہلا کام ہی یہی کروں گا۔

رات کو میں گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا کوچوان آیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ بابو آئیں تو مجھے بلا لیں۔

میں نے سوچا اس وقت کون بلائے۔ اگر جبار صاحب ہسپتال ہی کو جا رہے تھے اور فیکے کا کام ہو گیا ہے تو شکریہ صبح قبول کر لوں گا۔ اور اگر کام نہیں ہوا تو جو بھی کوشش ہو گی صبح ہی کو ہو گی۔

صبح کو میں ابھی بستر سے نہیں نکلا تھا کہ فیکے نے دروازہ کھٹکھٹایا معلوم ہوا کہ رات جبار صاحب ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ ان کی ڈیوٹی آج دن کی ہے۔

''یعنی تمہارا باپ دسمبر کی اس سردی میں برآمدے میں ہی پڑا رہا؟ میں نے اپنے انداز میں تشویش ظاہر کی۔

''جی ہاں۔'' وہ بولا۔ ''مگر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں بابو جی۔ آپ نے ہمارا گھر نہیں دیکھا دس سال سے چھپر میں پڑے ہیں۔''

''اور اس کی آنکھ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو چلی گئی بابو جی۔'' فیکا بولا جیسے اس کے باپ کی آنکھ کو ضائع ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''جب آنکھ جا ہی چکی ہے تو بے چارے بڈھے کو ہسپتال میں کیوں گھسیٹتے پھرتے ہو؟ وقت بھی ضائع ہو گا روپیہ بھی ضائع ہو گا۔''

فیکا بولا۔ ''بابو جی کیا پتہ آنکھ کے کسی کونے کھدرے میں بینائی کا کوئی بھورا پڑا رہ گیا ہو۔ دیکھیے چولہا بجھ جاتا ہے تو جب بھی دیر تک راکھ میں ہاتھ نہیں ڈالتے، کیا پتہ کوئی چنگاری سلگ رہی ہو۔''

میں اس بات سے چونکا۔ آج تک فیکے نے مجھ سے صرف چارے کی مہنگائی اور آٹے میں ملاوٹ کے موضوع پر باتیں کی تھیں۔ پھر وہ عاجزی سے بولا۔ ''بابو جی ذرا سا میرے ساتھ چل چلیے۔''

میرے جسم میں سے نیند ابھی پوری طرح غائب نہیں ہوئی تھی۔ پھر نہانا تھا۔ شیو کرنا تھا چائے پینی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میں تمہیں اپنا کارڈ دیئے دیتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر جبار کو دکھا دو۔ بڑے یار آدمی ہیں۔ فٹافٹ کام کر دیں گے۔ تمہارا باپ ایک بار وارڈ میں چلا جائے پھر علاج کے لیے تو میں خود جا کر کہوں گا۔''

وہ مجھ سے کارڈ لے کر یوں چلا جیسے دنیا جہاں کی دولت سمیٹے لیے جا رہا ہے۔ میں نے کارڈ پر لکھ دیا تھا۔ جبار صاحب! اس کا کام کر دیجیے۔ بے چارہ بڑا ہی غریب آدمی ہے۔ دعائیں دے گا۔ اور مجھے یقین تھا کہ کام ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کو صرف اتنا ہی تو دیکھنا تھا کہ آنکھ پوری طرح بجھ گئی ہے یا تھوڑی رمق باقی ہے۔

میں دن بھر گھر سے غائب رہا۔ اور فیکا دن بھر میرے گھر کے چکر کاٹتا رہا۔ شام کو اس نے مجھے بتایا کہ ''جبار صاحب بیٹھے تو ہیں پر کوئی اندر نہیں جانے دیتا۔ کہتے ہیں باری سے آؤ۔ اور میری باری آتی ہی نہیں۔ گھٹنا پاجامے میں سے جھانک رہا ہو تو باری کیسے آئے بابو جی۔''

فیکے نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا۔ نہ جانے پہلوان فیکے کے اندر یہ حساس فیکا اتنے برسوں سے کہاں چھپا بیٹھا تھا۔

میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور چلوں گا۔ اب تو شام ہو گئی ہے۔

دوسرے دن سویرے ہی مجھے شیخوپورے جانا پڑ گیا۔ رات کو واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا آیا تھا۔

اس کے بعد تین دن تک میں نے زیادہ وقت گھر میں گزارا مگر فیکا نہ آیا۔ چوتھے روز میں نے گلی کے موڑ پر ایک کوچوان سے فیکے کے باپ کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ اسے وارڈ میں جگہ مل گئی ہے۔ اتنے میں فیکا بھی آ نکلا۔ مجھے ذرا سی ندامت تھی اس لیے جھوٹ بولنا پڑا۔

''کیوں فیکے، جبار صاحب نے کام کر دیا نا؟''

وہ بولا۔''مگر بابو جی، وہ تو مجھ سے ملے ہی نہیں۔''

میں نے فوراً کہا۔''میں نے انہیں فون کر دیا تھا۔''

فیکے کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگ اٹھی۔''جبھی میں کہوں نرس بار بار یہ کیوں کہہ رہی ہے، کہ دیکھو بڈھے کو تکلیف نہ ہو۔''

پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ میرے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے مگر ذہن جیسے شکست کھا کر بھاگا جا رہا تھا۔ رات کو نیند نے ندامت دور کر دی۔ مگر صبح ہی فیکا دروازے پر موجود تھا۔ بولا۔''آپ کی مہربانی سے داخلہ تو مل گیا تھا پر اب انہوں نے بابا کو کوٹ لکھپت کے ہسپتال میں بھیج دیا ہے۔ یہ تو بڑا غضب ہوا بابو جی، آج میں اماں کو ساتھ لے کر گیا۔ دو روپے گل ہو گئے۔ کچھ ہو سکے تو کیجیے۔''

میں نے کہا۔''میں ابھی جا کر ڈاکٹر جبار کو فون کرتا ہوں۔''

میں نے فون کیا بھی مگر ڈاکٹر صاحب مل نہ سکے۔ پھر مصروفیتوں میں بات آئی گئی ہو گئی۔ پانچ چھ روز بعد میں نے فیکے کو دیکھا تو سوچا کہ نظریں چرا کے ساتھ والی گلی میں مڑ جاؤں اور وہاں سے بھاگ نکلوں۔ مگر فیکا لپک کر میرے پاس آیا اور بولا۔''بابو جی، سمجھ میں نہیں آتا آپ کے کس کس احسان کا بدلہ اتاروں گا۔''

جھوٹ نے میری ندامت کو کان سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔

''واپس آ گیا نا تمہارا بابا؟''

فیکا بولا۔''واپس بھی آ گیا اور آپریشن بھی ہو گیا۔ جمعہ کو پٹی کھل رہی ہے، دعا کیجیے۔''میں نے کہا۔''اللہ رحم کرے گا۔''

پھر وہ جمعہ کی شام کو آیا تو بولتے ہی زار زار رونے لگا۔ بابو جی غضب ہو گیا۔ پٹی کھلی تو پتہ چلا ایک آنکھ تو گئی ہی تھی۔ دوسری پر بھی اثر پڑ گیا ہے۔ کہتے ہیں اب پہلے آپریشن کا زخم ملے تو دوسرا آپریشن ہو گا۔ اور دوسری آنکھ کا بھی ہو گا۔''

میں نے اسے تسلی دی اور اسے ساتھ لے کر سامنے ہی ایک دکان سے ڈاکٹر جبار کو فون کیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ فون پر موجود نہ تھے۔ پھر میں نے اس سے وعدہ کیا کہ کل جا کر ڈاکٹر جبار سے ملوں گا۔ وہ ہسپتال میں نہ ہوئے تو انہیں گھر میں جا پکڑوں گا۔

دوسرے دن میں جا تو نہ سکا البتہ ڈاکٹر جبار کو فون ضرور کیا۔ وہ پھر غائب تھے۔ ادھر فیکا بھی غائب ہو گیا۔

شاید دو ڈھائی ہفتے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر نے آ کر بتایا کہ فیکا کوچوان آیا ہے۔ میں نے بھی اسے کھڑکی میں سے دیکھ لیا۔ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔

میں نے نوکر سے پوچھا۔''کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ میں موجود ہوں؟''

''جی ہاں۔''نوکر بولا۔''بس میرے منہ سے نکل گیا۔''

''بڑے احمق آدمی ہو۔''میں نے اسے ڈانٹا اور کہا۔''جاؤ کہہ دو کپڑے بدل رہے ہیں آتے ہیں۔''

کپڑے تو میں نے بدل رکھے تھے البتہ میں اپنے تیور بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ کتنا چھوٹا آدمی ہوں دو پیسے یا دو روپے یا چلو دو لاکھ کی بات نہیں۔ دو آنکھوں کی بات ہے اور میں جھوٹ بولے جا رہا ہوں۔ مجھے فیکے کے سامنے اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ پھر میں نے وہ فقرے سوچے جو مجھے فیکے کے سامنے اس انداز سے ادا کرنے تھے کہ اسے سچی بات بھی معلوم ہو جائے اور اسے دکھ بھی نہ ہو۔

میں باہر آیا تو فیکا بولتے ہی زار زار رونے لگا۔''بابو جی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا.....''اس کی آواز بھرا گئی۔

میرے سوچے ہوئے فقرے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔

بمشکل میں نے کہا۔ ''فیکے ..... بات یہ ہے کہ..... بات یہ ہے.....''

آنسوؤں سے بھیگا ہوا بچوں کی طرح گول گول سرخ چہرہ لیے فیکا اٹھا، اور بولا ''بابو جی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں شکر یہ ادا کروں تو کیسے کروں۔ میرا بابا ٹھیک ہو گیا ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ اسے بینائی اللہ نے دی ہے اور آپ کے ذریعے دی ہے۔ آپ نے مجھے خرید لیا ہے بابو جی..... قسم خدا کی میں عمر بھر آپ کا نوکر رہوں گا۔''

اور میں نے ایک بہت لمبی بہت گہری سانس لے کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں فیکے ..... کوئی بات نہیں.....''

☆☆☆☆

دخول مدینہ!

10 اکتوبر 2011ء..... وہ تاریخ جو زندگی میں ایک الگ شناخت و اہمیت رکھتی ہے مکہ مکرمہ روانگی اور پہنچنے کی تاریخ..... تین دن ایسے جذبے میں گزرے کہ پتہ ہی نہ چلا اور تیسرے دن کی شام جب اپنی بلڈنگ 40 میں واپس آئے تو نوٹس لگا ہوا تھا اگلے دن مدینہ روانگی کا.....!!

مدینہ.....! پتہ نہیں کس نے کہا تھا کہ فرانس، واشنگٹن اور لندن تو بس شہروں کے نام ہیں..... کون جانے شہروں کے ناموں میں ایک شہر ایسا بھی ہے جو راحت جان ہے.....! جس کا نام ہی دل میں ولولہ پیدا کر دیتا ہے..... آنکھ نم ہوتی ہے اور ساری سوئی ہوئی تمنائیں جاگ اٹھتی ہیں.....!!!

مدینہ مشک و عنبر سے زیادہ معطر فضاؤں والا شہر مدینہ..... میرے نبیؐ کا شہر وصال جسے اللہ نے قیامت تک کے لیے منور کر دیا مدینہ آپؐ کے روضہ شریف کی وجہ سے مدینہ منورہ کہلایا.....!!

مدینہ!! نام سنتے ہی دل مچل گیا..... مدینہ..... مدینہ..... مدینہ..... مدینہ کی گلیاں..... وہاں کے لوگوں کی مہمان نوازیوں کے تذکرے..... روئے زمین پر وہ جگہ جہاں روضہ مبارک ہے..... عرش بریں کی طرح مقدس ہے.....!!!

''کل مدینہ جانا ہے سامان تیار کر لینا.....'' میاں صاحب نے یاد دہانی کرائی..... مجھے چند لمحے قبل ہی شازیہ (پیر محل) کا مدینہ سے فون آیا تھا کہ باجی مدینہ میں موسم بہت خشک ہے اسی مناسبت سے سامان رکھیے.....

شازیہ میری دوست ہے..... بہت اچھی، سلجھی بچی.....
(ماشاءاللہ تین بچوں کی اماں ہے..... اتنی بھی بچی نہیں ہے)

اس کا حج پر جانے کا پروگرام بنا..... پہلے دن سے اس کی خواہش تھی کہ اکٹھے چلیں گے..... یہ ممکن نہ ہوا تو طے پایا کہ وہاں اکٹھے رہیں گے..... اور مردانہ پارٹی، وہاں رکاوٹ نہیں بنے گی.....!

جو اللہ کو منظور..... ہماری فلائٹس میں ایک ہفتہ کا وقفہ تھا ہم مکہ پہنچے تو وہ مدینہ روانہ ہوگئی اور یقیناً ہم مدینہ روانہ ہوں گے تو وہ واپس آ رہے ہوں گے.....

ابھی کہاں ناں جو اللہ کو منظور!!!

پھر بھی ہلکی سی شال، سوئٹر، کاٹن کے اور ریشمی سوٹ (حفظ ماتقدم) بیگ میں رکھے، کچھ لکھنے پڑھنے کا سامان بھی رکھا۔ تیاری مکمل تھی لیکن بسیں بلڈنگ تک نہیں آئی تھیں، بار بار سب پوچھ رہے تھے بسیں کب آئیں گی..... کہ عمران (چچازاد بھائی) کا فون آیا.....

''باجی آرام سے لیٹ جائیں مغرب سے پہلے آپ کی بسیں نہیں آئیں گی..... اور جب روانہ ہوگئیں تو نو دس گھنٹے میں پہنچائیں گی'' سو اپنے چھوٹے بھائی (اب اتنا بھی چھوٹا نہیں، تین بچیوں کا باپ ہے..... ماشاءاللہ) کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے گاؤن پہن کر ہی بیڈ پر لیٹ گئی۔

شاہدہ اور مسرت دونوں میری ''روم میٹ'' بھی حالت انتظار میں تھیں۔ وقتاً فوقتاً میں انہیں مدینہ اور مدینہ والے کی میٹھی میٹھی باتیں سنانے کا شرف حاصل کرتی رہی تا آنکہ بسوں کے آنے کی نوید سنائی دی..... سامان رکھا گیا..... کارڈوں کے حساب سے بسوں کے نمبر الاٹ کیے جا رہے تھے۔ ہم بھی اپنی بس میں بیٹھ گئے..... شوق غالب تھا لہٰذا بس میں بیٹھنا اور بیٹھے رہنا اچھا لگ رہا تھا..... شارع منصور کے دونوں جانب عمارتیں راہ گیر..... بھاگتی دوڑتی، ٹرانسپورٹ اور

مدینہ کیسی بستی ہے.....؟ کا سوال ذرا بھی سست نہیں کر رہا تھا..... بالآخر شام کے وقت بسیں روانہ ہوئیں..... جونہی بس مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہوئی..... بالکل اچانک.....ایک دم جیسے میرا دل کسی نے دبوچ لیا ہو.....!!

آنکھوں سے آنسو بہنے لگے..... مکہ سے رخصتی..... الوداع مکہ.....اور ساتھ ہی چودہ سو چالیس سال قبل کا وہ دن میرے تصور میں چھم سے آ گیا۔ وہ مکہ جس میں صرف تین دن رہنے سے مجھے بے پناہ انسیت محسوس ہو رہی ہے.....عمرہ کی مشقت کے علاوہ مسلسل حالت سفر میں رہنے، پیدل بلڈنگ سے پونے دو کلومیٹر حرم تک پہنچنے اور پھر دو تین عمروں سے بھی زیادہ ڈھونڈنے سے مشقت کے باوجود میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی کیوں ہوں.....؟؟

مکہ تجھے چھوڑنا میرے لیے اتنا مشکل ہے کہ میرا دل پارہ پارہ ہو رہا ہے..... میرے محبوب ﷺ اور ابو بکر صدیقؓ کے لیے جہاں انہوں نے چالیس سال سے زائد عرصہ گزارا..... جوان کا ''جم پل'' تھا۔ جہاں ان کے سنگی ساتھی رہتے تھے..... جہاں کے در و دیوار ان کے کردار کی عظمتوں اور پاکیزگی کے گواہ ہیں۔ اس شہر مکہ کو ان دونوں ہستیوں نے کس دل گردے سے چھوڑا ہوگا؟ کتنا جگرے کا کام ہے اپنے گھر اور شہر کو چھوڑ کر جانا!!!

میں نقاب کے نیچے آنسو پونچھتی جا رہی تھی..... اور میرا دل اپنے نبیؐ کے دکھ میں شریک تھا.....کس درد سے ان کے منہ مبارک سے یہ الفاظ نکلے ہوں گے۔

''مکہ تو مجھے بہت عزیز ہے لیکن تیرے بیٹے مجھے یہاں جینے نہیں دیتے.....''

اور کیا خبر واپسی کی کوئی امیدوں بھری کرن ان کے ساتھ ہوگی یا نہیں.....؟

بس آہستہ آہستہ رینگنا شروع ہوئی۔ سورج ڈوبنے کے منظر کے ساتھ ہی دونوں جانب سیاہ پہاڑ اور پھر ان کے ہیولے ہیبت ناک لگنے لگے۔ اذانوں کی آواز جلد ہی آنا شروع ہوگئی۔ اور ہماری بس چھوٹی سی مسجد کے سامنے رک گئی.....عورتوں کے حصے میں بمشکل پچیس تیس عورتوں کی نماز کی گنجائش تھی۔ زیادہ تر ہماری بس کی خواتین تھیں بس ایک اجنبی خاتون..... یقیناً عرب تھی، اس کا مکمل باپردہ سیاہ گاؤن، ہاتھوں پر دستانے ظاہر کر رہے تھے کہ یہ نظام صلوٰۃ کی برکتوں والے علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ چار چھ ماہ کی بچی اس کے ساتھ تھی۔ ہم سات سال تک بچوں کو نماز سے دور رکھتے ہیں وہ ہر وقت ہر جگہ ساتھ رکھتے ہیں میں نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں دریافت کیا کہ وہ کہاں سے تعلق رکھتی ہے عربی تو اسے کیا سمجھ میں آتی ہاں اشارے یا یہ کہ سوال بھی یہی ہوسکتا ہے کے مصداق.....

''عرب'' کا عین اس قدر شد و مد سے ادا کیا کہ عربوں کی فصاحت و بلاغت کی قائل ہوگئی۔

نماز کے فوراً بعد پھر بسوں کا قافلہ شہر نبیؐ کی طرف روانہ ہوا۔ چونکہ عرب میں دوران سفر دو نمازوں کو جمع کرنے کا رواج ہے لہٰذا عشاء کے لیے بسیں نہیں رکیں اور وہ پاکستانی جو عشاء کے وقت بس رکنے پر اپنے کاموں کی تکمیل چاہتے تھے وہ سیخ پا ہو رہے تھے.....اللہ اللہ کر کے رات دس بجے کے بعد بس پھر رکی اور ایسی رکی کہ چلنے کا نام ہی نہ لے..... بار بار سامان چیک ہونے کا ڈراوا دیا جا رہا تھا.....اب سوچ کر ہنسی آ رہی ہے کہ اس وقت تو یہ سنتے ہی ''تراہ'' نکل رہا تھا حالانکہ اس میں کون سا سمگلنگ کا سامان تھا.....!!!

بہرحال رکتے، چلتے، تہجد کا وقت ہوگیا سوائے ڈرائیور کے اور میرے تقریباً سارے ہی نیند کے کچھ نہ کچھ ''جھونکے'' لے چکے تھے..... میں نے سیرت کی تمام کتب کے خلاصے ذہن میں ''لائن حاضر'' کیے۔ درود ابراہیمی کی تسبیح کی.....تقریباً نو دس گھنٹے سے زیادہ وقت ہوگیا تھا ہمیں مکہ سے روانہ ہوئے۔

ایک دم سائن بورڈ سڑک پر نظر آئے۔

''دخول مدینہ.....''

میرا دل خوشی سے دھک دھک کرنے لگا.....دخول مدینہ..... میں نے ان کو اٹھایا.....مدینہ آ گیا! یہ بھی سیدھے ہوئے اور ساتھ ہی

بس ایک ہوٹل کے سامنے رک گئی.....

وضو کیا.....نوافل ادا کیے..... چائے بھی پی لی.....ایک دو چکر بھی پارکنگ کے لگائے لیکن بس کے چلنے کے کوئی آثار نہ تھے.....تھکن کی وجہ سے کچھ آرام کو دل چاہ رہا تھا۔''یہاں کی بسوں میں سواریوں کے اترتے ہی لاک لگ جاتا ہے۔ انہوں نے اطلاع دی..... ''بہرحال تم یہاں بیٹھو میں پتہ کرتا ہوں.....'' دس بارہ منٹ کے بعد جب پتہ کر کے آئے تو ہاتھوں میں چابی کی بجائے کھجور کا پیکٹ تھا.....

''یہ کیا! ابھی خرید لیں.....؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا..... وہ کچھ چپ سے تھے.....

''مدینہ سے واپسی پر خرید لیتے ابھی سے خرید لیں.....خراب ہی نہ ہو جائیں.....؟'' میں نے خدشہ ظاہر کیا

''یہ تو..... مجھے ملی ہیں.....'' ان کا لہجہ کچھ اور طرح کا تھا..... ''وہ.....اصل میں.....ادھر ایک آدمی دھڑا دھڑ سب حاجیوں کو یہ پیکٹ دے رہا ہے.....''

میں نے پیکٹ ان کے ہاتھ سے لیا.....کم و بیش ایک کلو وزنی تھا..... میں نے ان کے ساتھ باہر جھانک کر دیکھا.....نوعمر لڑکا گتے کے بڑے بڑے کارٹن سامنے رکھے دونوں ہاتھوں سے لپالپ پیکٹ نکال کر دے رہا تھا..... اور لینے والے جھنگ، چنیوٹ، ٹوبہ کے باشندے.....صورت حال ایسی تھی کہ.....

بھائی میرے بیٹے کا بھی دے دو.....

میری اماں کا بھی دے دو.....

دینے والا بس دیئے جا رہا تھا.....ایک کارٹن ختم ہوتا تو دوسرا کھل جاتا.....منوں کے حساب سے کھجوروں کے پیکٹ اس نے منٹوں سیکنڈوں میں دے دلا کر سب مسافروں کے دل خوش کر دیئے۔

یہ تھا مدینہ کے مضافات میں ہمارا استقبال! فیاضی اور سخاوت کا عملی مظاہرہ توقع سے پہلے دیکھ لیا..... پھر ذہن چودہ سو سال قبل کے زمانے میں پہنچ گیا.....

مکہ میں پیدا ہونے ''پرورش پانے' پلنے بڑھنے والے'' صادق و امین کہلوانے والے..... فتح مکہ کے بعد جب اپنا پیارا مکہ.....اپنی مٹھی میں تھا.....

فاتح کی حیثیت سے جیسا قیام چاہتے اور جہاں چاہتے رہ سکتے تھے.....وہ واپس مدینہ کیوں چلے گئے.....؟؟

کیا مکہ یاد نہیں رہا تھا.....

یا مکہ والوں کی زیادتیاں، اذیتیں بھول نہیں پائے تھے.....!!

نہیں کچھ بھی تو نہیں.....بس یہی دریا دلی.....انصار مدینہ کا صرف گھر بار، جائیدادیں پیش کرنا نہیں.....اپنے اپنے دل تمام تر اثاثوں کے ساتھ اپنے محبوبؐ کی خدمت میں نذرانہ کرنا.....

''یارسول اللہؐ.....قریش مال لے گئے'' تو آپ نے جواب میں کیا ارشاد فرمایا تھا.....؟؟

''انصار مدینہ! تم اس بات پر راضی نہیں کہ قریشِ مکہ مال لے جائیں.....اور تم اپنے محبوب کو لے جاؤ.....''

اور یہ انصار مدینہ..... رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا زندگی میں ہی سرٹیفکیٹ لینے والے..... اسے سن کر کتنا روئے تھے.....!! ہچکیاں بندھ گئی تھیں.....!!!

طلع البدر علینا.....ننھی سی تتلیوں کا استقبال.....

روزانہ مدینہ کی پہاڑی سے چڑھ کر جائزہ لینا..... رسول اللہ آ رہے ہیں یا نہیں.....!

اور جب وہاں پہنچے تو کیسا استقبال ہوا تھا.....!!

دنیا تو دنیا عرشوں والے فرشتے بھی ایسا استقبال دیکھ کر دنگ رہ گئے ہوں گے.....

میں نے اپنے آپ سے کہا.....

قانتہ! اگر یہ تمہاری توقع سے کہیں زیادہ مثالی منظر ہے تو سوچو.....رحمتہ للعالمین کا دخول مدینہ کا منظر کیسا دل خوش کن.....سہانا اور انوکھا ہو گا.....طلع البدر علینا..... کے نذرانہ کے ساتھ میں نے کھجوروں کے پیکٹ تھام کر بیگ میں رکھ لیے۔

☆☆☆☆

آسیہ راشد

دوسری صاحبزادی

حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہؐ

آپؓ کا نام رقیہؓ ہے۔ آپؓ محمدؐ اور خدیجہؓ کی منجھلی صاحبزادی تھیں اور زینبؓ کی سگی بہن۔ آپؓ بعثت نبوی سے سات برس قبل پیدا ہوئیں۔ اس وقت محمدؐ کی عمر مبارک تینتیس برس تھی۔ آپؓ حضرت زینبؓ سے تین برس چھوٹی تھیں۔

آپؓ حسن و جمال سیرت وصورت اور عقل وفہم میں اپنی تمام بہنوں اور ہمجولیوں سے بڑھی ہوئی تھیں۔

نکاح: روسائے قریش ان کی دانائی، عقل مندی اور ہونہاری دیکھ کر حیرت میں آجاتے۔ بہت سے لوگ انہیں اپنے گھرانے کی زینت بنانے کے خواہش مند تھے۔

قبل از نبوت: حضورؐ نے اپنی دو صاحبزادیوں رقیہؓ اور ام کلثومؓ کا نکاح اپنے سگے چچا ابولہب کے دونوں بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے کر دیا۔ تاہم ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کیونکہ دونوں کم سن تھیں اس وقت حضرت رقیہؓ کی عمر صرف آٹھ برس تھی۔

بعثت نبوی کے بعد قریش کی مخالفت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اہل مکہ آپؐ کی جانب کے دشمن ہو گئے خصوصاً آنحضرتؐ کا سگا چچا ابولہب تو آپؐ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا۔ اس سے دوطرح کی رشتہ داری بھی تھی مگر اس نے دشمنی اور عداوت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

ایک صحابی حضرت ربیعہ بن عبادؓ بیان کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں ایک بار میں مکہ کے بازار عکاظ میں کھڑا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ لمبے لمبے بالوں والے ایک حسین و خوبصورت شخص جن کے چہرے سے رحمانی نور اور ملکوتی تقدس نمایاں ہو رہا تھا بازار میں کھڑے ہو کر لوگوں کو ایک خدا کی بندگی کرنے اور شرک و مصیبت سے باز آنے کی نصیحت کر رہے ہیں اتنے میں ایک اور شخص وہاں آ پہنچا اور کہنے لگا اے لوگو! اس شخص کی باتوں میں نہ آنا یہ گمراہ ہو گیا ہے اور اپنے باپ دادا کے مذہب کو برا کہتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے فرشتہ صورت آدمی کو پتھر مارنا شروع کر دیئے یہاں تک کہ آپ زخموں سے چور ہو گئے اور آپؐ کا تمام جسم لہولہان ہو گیا۔

ربیعہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا اے لوگو! یہ لمبے گیسوؤں والا رعنا جوان کون ہے؟ تو لوگوں نے جواب دیا۔ یہ محمدؐ ابن عبداللہ ہیں۔

میں نے پوچھا جو شخص ان پر پتھراؤ کر رہا ہے۔ وہ کون ہے؟

لوگوں نے کہا یہ ان کا سگا چچا ابولہب ہے۔ (بنات الرسول)

ابولہب کی بیوی ام جمیل بھی حضورؐ کی تکلیف دہی ایذا رسانی میں شوہر سے کچھ کم نہ تھی۔ اس کا کام یہ تھا دن میں جنگل میں جا کر وہاں سے جھاڑ کانٹے اٹھا لاتی اور رات میں انہیں حضورؐ کے راستے میں بکھیر دیتی۔ حضورؐ صبح کو ادھر سے گزرتے تو آپؐ کے پائے مبارک کانٹوں سے زخمی ہو جاتے۔

جب ان میاں بیوی کا یہ عداوت آمیز رویہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت میں وحی نازل فرمائی جو قرآن میں سورۃ لہب کے نام سے موجود ہے۔

جب اس سورۃ کے نازل ہونے کی خبر ابولہب کو ملی تو وہ دونوں میاں بیوی سخت غضبناک ہوئے۔ ابولہب نے غصے میں دانت پیستے ہوئے اپنے بیٹے عتبہ سے کہا، اگر تم نے رقیہ بنت محمدؐ کو طلاق نہ دی تو میری زندگی اور تمہارے ساتھ میرا اٹھنا بیٹھنا حرام

ہے۔ عتبہ نے اپنے والدین کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت رقیہؓ کو طلاق دے دی۔ (طبقات)

اس وقت تک عتبہ سے صرف عقد ہوا تھا۔ ہنوز رخصتی نہ ہونے پائی تھی کہ طلاق وقوع میں آئی۔ (کتاب النساء)

حضرت رقیہؓ کا عقد ثانی اور حضرت عثمانؓ کا قبول اسلام۔

حضرت عثمانؓ اپنے قبول اسلام اور شادی کا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں خانہ کعبہ کے صحن میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ دفعتاً کسی آدمی نے آ کر مجھے یہ اطلاع دی کہ حضورؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کا عقد عتبہ بن ابی لہب سے کر دیا۔ چونکہ رقیہؓ حسن و جمال اور اپنے قابل رشک اوصاف کے لحاظ سے امتیاز رکھتی تھیں اس لیے میرا رجحان خاطر ان کی طرف تھا۔ جب یہ خبر پہنچی تو میں مضطرب ہو گیا اور سیدھا گھر پہنچا۔ اتفاق سے گھر میں میری خالہ سعدہ تشریف رکھتی تھیں جو کہانت میں ماہر تھیں، مجھے دیکھتے ہی بے ساختہ بولیں۔

اے عثمان تمہیں مژدہ ہو اور تم پر تین مرتبہ سلام پہنچے پھر تین مرتبہ، پھر تین مرتبہ تم پر سلام پہنچے پھر تین بار پھر ایک سلام پہنچے تا کہ دس سلام پورے ہو جائیں۔

خدا کرے تم بھلائی سے ملو اور برائی سے بچائے جاؤ خدا کی قسم تم نے ایک عفیفہ اور حسینہ و جمیلہ خاتون سے نکاح کیا ہے۔ تم بھی کنوارے ہو اور کنواری تم کو مل گئی۔ ایک بڑے عظیم جلیل القدر کی بیٹی تم نے پائی۔

ان کی ایسی گفتگو سے مجھے بہت تعجب ہوا میں نے پوچھا خالہ آپ کیا فرما رہی ہیں؟ کہا.....

عثمان..... اے عثمان اے عثمان تم صاحب جمال اور صاحب شان ہو یہ نبی صاحبِ برھان ہیں وہ رسول برحق ہیں۔ ان پر قرآن نازل ہوا ہے۔ ان کا اتباع کرو اور بتوں کے قریب نہ جاؤ۔ (ماخوذ اصابہ)

ان کی گفتگو نے میرے دل پر بہت اثر کیا اور میں مال کار پر غور وفکر کرنے لگا۔ میں اکثر حضرت ابوبکر کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ دو روز کے بعد میں ان کے پاس گیا اور خالہ کی گفتگو کا حال بیان کیا انہوں نے کہا تمہاری خالہ نے جو کچھ کہا ہے بالکل سچ کہا ہے تم خود دانش مند ہو۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے مجھے اسلام کی دعوت دی۔ ابھی وہ بات کر ہی رہے تھے کہ رسول خدا حضرت محمدؐ وہاں تشریف لائے اور آتے ہی ارشاد فرمایا، عثمان خدا تمہیں جنت کی طرف بلاتا ہے کیا تم اس بلاوے کو قبول کرتے ہو؟ سنو میں خدا کا رسولؐ ہوں اور خدا کی طرف سے تمہارے پاس بھیجا گیا ہوں۔

کہنے کو تو یہ صرف چند جملے تھے مگر یہ میرے قلب و ذہن میں نشتر بن کر اتر گئے۔ خدا گواہ میرا دل قابو میں نہ رہا اور میں بے اختیار پکار اٹھا..... لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدُ الرَّسُوْلُ اللّٰه.....

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد عتبہ نے حضرت رقیہؓ کو طلاق دے دی اور وہ میرے نکاح میں آ گئیں۔ (کتاب النساء)

اسلام: حضرت رقیہؓ اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ہی اسلام لائیں اور بیعت اس وقت کی جب اور عورتیں آنحضرتؐ کی بیعت سے سرفراز ہوئیں۔ (اصابہ دور المنثور)

ہجرت: نبوت میں حضرت رقیہؓ نے اپنے شوہر حضرت عثمانؓ کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی چونکہ اب حضرت عثمانؓ پر کافروں کے ظلم وستم کی انتہا ہو چکی تھی اور اندیشہ تھا کہ کفار آپؐ کے بعد جگر گوشۂ رسولؐ حضرت رقیہؓ کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہ کریں اس لیے آپؐ نے انہیں حبش کی طرف ہجرت کرنے کے اجازت دے دی۔

آنحضرتؐ نے اپنی پیاری بیٹی رقیہؓ اور عثمانؓ کی خبر گیری کیلئے اسماؓ بنت ابوبکرؓ کو ان کے ساتھ ساحل سمندر تک بھیجا۔ حضرت اسماؓ نے سفر کا تمام سامان درست کیا۔ حضرت رقیہؓ کو ناقہ پر سوار کر کے سمندر کے ساحل تک لے گئیں وہاں انہیں رخصت کر کے واپس حضورؐ کی

خدمت میں پہنچیں اور عرض کیا یارسول اللہؐ عثمانؓ اپنی بیوی رقیہؓ کو لے کر چلے گئے۔

ابھی آپؐ نے اطمینان کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ معلوم ہوا کہ قریش کی ایک جماعت حبشہ جانے والے مسلمانوں کے تعاقب میں گئی ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ دشمنوں کے پہنچتے پہنچتے مسلمانوں کا قافلہ کشتیوں میں بیٹھ کر ساحل سے بہت دور جا چکا تھا اور دشمنوں کو ناکام ونامراد واپس آنا پڑا۔

جب آپؐ کو اطمینان ہوا تو آپؐ نے فرمایا ابراہیمؑ اور لوطؑ کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنی بیوی کے ہمراہ ہجرت کی ہے۔ (اصابہ)

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا حضرت ابراہیمؑ اور ان کی بیوی کے بعد عثمانؓ اور رقیہؓ دوسرے شخص ہیں جو خدا کی محبت میں ہجرت کرنے والے ہیں اور عثمان مجھ سے اور ابراہیم سے بہت مماثل ہیں۔

حضرت عثمانؓ کی اور رقیہؓ کی شان وعظمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے جن کے فضائل ومراتب میں حضورؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔

ہجرت کے بعد عرصہ تک حضور کو پیاری بیٹی اور داماد کی کوئی خبر نہ ملی جس سے آپؐ کو بہت تشویش تھی۔ اسی اضطراب کے عالم میں روزانہ مکہ سے باہر تشریف لے جاتے اور جب بھی حبشہ کی طرف سے کوئی راہگیر آتا ہوا دکھائی دیتا تو آپؐ اس سے عثمان اور رقیہ کی خبر پوچھتے۔ اتفاق سے ایک دن ایک بڑھیا سے ملاقات ہوئی جو حبشہ سے آرہی تھی۔ حضورؐ نے اس سے ان لوگوں کی خیریت دریافت کی تو عورت نے کہا کہ میں نے رقیہ اور عثمان کو دیکھا ہے دونوں خیریت سے ہیں تو تب آپؐ کو اطمینان قلبی حاصل ہوا۔

حبش میں وہ کافی عرصہ تک رہے۔ وہیں قیام کے دوران انہیں یہ خبر ملی کہ حضورؐ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والے ہیں چنانچہ کچھ دوسرے مسلمانوں اور حضرت رقیہؓ کے ہمراہ انہوں نے مکہ کی طرف مراجعت کی جب آپ دونوں مکہ آئے تو یہاں آکر معلوم ہوا کہ یہاں پر مسلمانوں پر پہلے سے زیادہ ظلم وستم ہو رہے ہیں مجبوراً حضرت رقیہؓ اپنے شوہر حضرت عثمانؓ کے ساتھ دوبارہ حبش کی طرف لوٹ گئیں۔

انہی دنوں رسول اللہ نے مدینہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا اور تمام مسلمانوں سے کہہ دیا گیا کہ وہ مدینہ کی طرف جانے کی تیاری کر لیں۔ جب حضرت عثمانؓ نے یہ خبر حبشہ میں سنی تو وہ حضرت رقیہؓ کو ساتھ لے کر دوبارہ مکہ آئے اور چند دن بعد رسولؐ کی اجازت سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں حضرت اوس بن ثابتؓ (جو حسان بن ثابتؓ کے بھائی تھے) کے گھر ٹھہرے اور ان سے آپؓ کا بھائی چارہ ہوا۔

حضرت رقیہؓ بہت خوبیوں کی مالک تھیں وہ اپنے شوہر سے جانثارانہ محبت رکھتی تھیں۔ صبر وشکر، ضبط وتحمل ان کی فطرت میں تھا جس کی بنا پر ہجرت کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے قبول کیں۔ آپؓ کا اخلاق بہترین تھا۔ آپؓ خوش مزاج، خوش اطوار اور نہایت عبادت گزار تھیں۔

آپؓ شادی کے بعد بھی اپنے والد کی خدمت کرتیں۔ جب حضورؐ ان کے گھر تشریف لاتے تو آپ کے سر پر تیل لگاتیں۔ کنگھی کرتیں، سرمہ لگاتیں، ایک بار اسی طرح آپؐ کی خدمت کر رہی تھیں کہ حضورؐ نے پوچھا رقیہ! عثمان کا برتاؤ تم سے کیسا ہے؟ بولیں بہت اچھا ہے۔ حضورؐ بہت خوش ہوئے اور فرمایا بیٹی اپنے شوہر کی بزرگی کا لحاظ رکھنا وہ عادات واخلاق میں مجھ سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ (ازالۃ الخفا)

آپؓ قریش کی حسین ترین خواتین میں سے تھیں۔ اپنے حسن وجمال کی وجہ سے مکہ بھر میں مشہور تھیں اللہ تعالیٰ نے انہیں شوہر (عثمانؓ) بھی ایسے عطا کیے جو جوانانِ قریش میں امتیازی خصوصیات کے حامل تھے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ کا بیان ہے کہ ایک بار رسول خداؐ نے مجھے کچھ بھنا ہوا گوشت دیا اور فرمایا کہ جا کر عثمانؓ کے گھر دے آؤ۔

میں وہاں گیا تو دیکھا حضرت رقیہؓ اور عثمانؓ ایک ہی چٹائی پر بیٹھے ہیں یہ دونوں میاں بیوی اس قدر حسین تھے کہ میں کبھی ایک کو دیکھتا تو کبھی دوسرے کو۔ واپس آ کر میں نے حضورؐ سے اس بات کا ذکر کیا تو حضورؐ نے فرمایا!

اسامہؓ کیا تم نے کبھی ان دونوں میاں بیوی سے اچھا جوڑا دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا..... جی نہیں یارسول اللہ!

اولاد: حضرت رقیہ کے صرف ایک صاحبزادے پیدا ہوئے جن کا نام عبداللہ تھا۔ حضرت عبداللہ کی پیدائش حبشہ میں ہوئی اپنے صاحبزادے کی نسبت سے حضرت عثمانؓ نے اپنی کنیت ابوعبداللہؓ اختیار کی۔

حضرت عبداللہ کی عمر ابھی چھ برس تھی کہ ایک مرغ نے ان کی آنکھ میں چونچ ماری جس سے تمام چہرہ متورم ہو گیا اور سارے جسم میں بیماری پھیل گئی اور یوں 4ھ میں وفات پائی۔ حضورؐ نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت عثمانؓ نے قبر میں اتارا۔

وفات: ہجرت کے دوسرے سال ہی حضرت رقیہؓ کو چیچک کے مرض نے آ لیا (استیعاب) حضرت عثمانؓ آپؓ کے علاج اور تیمارداری میں مصروف تھے اچانک اسی عالم میں مشرکین نے مدینہ پر حملہ کر دیا۔ آپؐ نے عام اعلان کروا دیا کہ تمام مسلمان مقابلہ کیلئے تیار ہو جائیں حضرت عثمانؓ کیلئے بہت مشکل وقت تھا ایک طرف غم گسار بیوی بستر مرگ پر پڑی تھی دوسری طرف جہاد پہ جانے کی تمنا تھی۔ فرض اور محبت میں کشمکش تھی۔ آخر انہوں نے جہاد پر جانے کو ترجیح دی اور تیاری شروع کر دی۔ آنحضرتؐ کو جب ان کا ارادہ معلوم ہوا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا عثمانؓ اگر تم بھی چلے گئے تو رقیہؓ کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا کیا میں جہاد کا شرف حاصل نہ کر سکوں گا؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا اطمینان رکھو تمہیں رقیہؓ کی تیاری کرنے میں مجاہدین کے برابر ثواب ملے گا اور مال غنیمت سے بھی تم پورا حصہ پاؤ گے۔ (سیرت ابن ہشام)

مجبوراً حضرت عثمانؓ آپؐ کے حکم کے مطابق اپنی زوجہ کی تیمارداری کیلئے رک گئے مگر ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ مشیت ایزدی کا فیصلہ آ چکا تھا۔ یوں 6 ہجری میں صرف 23 سال کی عمر میں آپؓ نے وفات پائی۔ حضرت عثمانؓ نے بہت صبر اور حوصلہ سے ان کے کفن دفن کا انتظام کیا۔ عین اس وقت جب قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی حضرت زید بن حارثہؓ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کی فتح کی خوشخبری لے کر مدینہ میں داخل ہوئے۔

سرور عالمؐ اپنی لخت جگر کی وفات کی اطلاع پا کر بہت مغموم ہوئے اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مدینہ واپس تشریف لا کر حضورؐ حضرت رقیہؓ کی قبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا۔

''عثمان بن فطعون جا چکے اب تم بھی ان سے جا ملو.....

(مہاجرین میں عثمانؓ بن فطعون پہلے صحابی تھے جنہوں نے مدینہ میں وفات پائی)

حضورؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سن کر انصار و مہاجرین کی خواتین سسک سسک کر رو پڑیں پورے مدینہ میں غم کی فضا چھا گئی۔ حضرت عمرؓ عورتوں کو روتا دیکھ کر غصے میں آ گئے حضورؐ نے انہیں منع فرمایا اور کہا عمرؓ انہیں رونے دو، دل اور آنکھ کے رونے میں کوئی حرج نہیں البتہ نوحہ و بین سے بچنا چاہیے۔

حضرت فاطمہؓ الزہرا بھی اپنی بہن کی قبر پر تشریف لائیں اور قبر کے کنارے بیٹھ کر رونے لگیں۔

حضورؐ ان کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو اپنی چادر مبارک سے پونچھتے رہے اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

حضرت عثمانؓ اور رقیہؓ میں باہم بے حد محبت تھی ان کے تعلقات اتنے خوشگوار اور مثالی تھے کہ لوگوں میں یہ مقولہ ان کی نسبت سے مشہور ہو گیا تھا۔

بہترین میاں بیوی جنہیں لوگ دیکھیں، رقیہؓ اور ان کے شوہر عثمانؓ ہیں۔ (اصابہ کتاب النسا)

☆☆☆☆

شمیم فاطمہ

کاہے کو بیاہی.....!!

کہتے ہیں زمانہ بڑا استاد ہوتا ہے سب کچھ سکھا دیتا ہے، مگر گھروں کو بسانے کا فن نجانے ہم کب سیکھیں گے!!

گھر کی چار دیواری، خیام کی رباعی، دنیا کی بزم آرائی، میر کے دیوان اور ہمارے پارلیمنٹ سے صنف نازک کو نکال دیا جائے تو..... (تو باقی کیا رہ جائے گا) تو یہ کائنات ایک دشت ہو بن کر رہ جائے.....

اس بات کو آپ باآسانی یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ڈراموں اور فلموں سے ہیروئن، رقص سے امراؤ، اشتہارات سے ماڈلز، کوچنگ سنٹرز سے طالبات اور کچن سے بیگمات کو نکال دیا جائے تو باقی کیا رہ جائے گا!! (بے شک باقی رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے)

اللہ نے تو باوا آدمؑ کو یہ سجی سجائی جنت، یہ اعزاز پیغمبری، یہ خلعت فردوس، یہ مسجودگیِ ملائیک، سب کچھ تو عطا کر رکھا تھا مگر باوا آدمؑ تھے کہ یہی سوچے جا رہے تھے

بھری جنت میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

معلوم نہیں وہ سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں ایک عدد غمگسار، راز دار، دوست و غمخوار کی ضرورت ہے (دیار ''خلد'' میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو..... کوئی تو ہو جو میری وحشتوں کا ساتھی ہو)..... اور انہوں نے بندہ عاجز کی طرح اپنے رب کے حضور یہ دعا کی تھی کہ ''اے اللہ! جہاں تو نے مجھے یہ ساری نعمتیں عطا کی ہیں وہاں ایک نعمت عظمیٰ اور عطا کر دے۔ مولا! مجھے حوا عطا کر دے۔

یا پھر رب عظیم نے جو دلوں کے حال بھی جانتا ہے اس نے مانگنے سے پہلے ہی باوا آدمؑ کو اماں حوا عطا کر دی۔ اور اس طرح آدمؑ و حوا نے دنیا میں ''جوڑی'' کی بنیاد رکھ دی (اس مقام پر ابن آدم یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب کام ختم، اب کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں..... گویا

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

مگر کہتے ہیں زمانہ بڑا استاد ہوتا ہے سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ ابن آدم کو بھی معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ اس کے بعد تو مانگنے کے لیے جو ہاتھ اٹھتے ہیں تو تاحیات اٹھے ہی رہ جاتے ہیں)۔

دنیا میں پہلی ''جوڑی'' کے وجود میں آتے ہی یہ بات مشہور ہو گئی کہ ''جوڑے'' آسمانوں پر بنتے ہیں۔ جوڑے آسمانوں پر بنیں یا زمین پر بنائے جائیں ہوتا وہی ہے جو آدم و حوا کے ساتھ ہوا۔ یعنی اس ''اٹوٹ بندھن'' میں بندھتے ہی ''سازشی عناصر'' سرگرم ہو گئے اور سر منڈواتے ہی اولے پڑنا شروع ہو گئے۔ دونوں کے درمیان شیطان حائل ہو گیا (اور آج تک حائل ہے..... کبھی ساس بن کر، کبھی رقیب بن کر، کبھی دوست بن کر، کبھی شک بن کر، کبھی انا بن کر.....) کہتے ہیں کہ

دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں

اور جنت کا تصور بھی کسی حور کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ گھر بنانے کے لیے حورانہ خصوصیات کی حامل لڑکی کی تلاش جو شروع کی جاتی ہے تو پھر ایسی مشکل پڑ جاتی ہے جیسے سیاستدانوں میں دیانت دار حکمران کی تلاش۔

ارے نہیں..... یہ کچھ مناسب نہیں..... اس کا رنگ اچھا نہیں لگ رہا..... یہ میرے بھائی کے ساتھ نہیں جچے گی..... وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن ذرا آپ قد بھی تو دیکھیں..... جی! سب ٹھیک ہے لیکن ایجوکیشن..... ہاں لڑکی تو صحیح ہے لیکن فیملی بھی تو صحیح ہو، بالکل

بیک ورڈ ہے.....لڑکی ٹھیک ہے مگر اس کی ماں.....توبہ! توبہ!..... نہیں بھئی کوئی اور دکھائیں.....لڑکی کی رہائش بھی تو دیکھیے.....آپ کو پتہ ہے کہ ہم اچھی فیملی سے بیلونگ کرتے ہیں یہ تو نہ ہو کہ لڑکا اپنی سسرال کا پتہ بتاتے ہوئے شرمندہ ہو..... نہیں بھئی یہ نہیں، اتنی سنجیدہ! شکل سے ہی ماسٹرنی لگ رہی ہے.....اب ایسی بھی نہ ہو یہ تو کھڑی کھڑی بیچ دے گی ہمیں.....غرضیکہ جنت بنانے کے لیے کسی حور کی تلاش (نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں!) کوئی آسان بات نہیں، بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا.....

لیکن جب آدمی دریا میں چھلانگ لگا ہی دے تو بالآخر اس پار نکل ہی آتا ہے.....سو یہ تلاش کہیں نہ کہیں ختم ہو جاتی ہے یا کرنی پڑ جاتی ہے۔ دونوں جانب سے شرائط قبول کر کے سرِتسلیم خم کر دیا جاتا ہے اور شادی خانہ آبادی کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ شادیانے خوشی کے بجائے جاتے ہیں۔ دونوں جانب تحفے تحائف، لڈوؤں پھولوں کے تبادلے ہوتے ہیں بڑھ چڑھ کر شاپنگ ہوتی ہے۔ اوقات سے بڑھ کے بری تیار کی جاتی ہے، چادر سے بڑھ کے پیر پھیلائے جاتے ہیں..... مہنگے سے مہنگا ہال، اچھے سے اچھا کھانا، زیادہ سے زیادہ مہمان.....غرضیکہ منگنی سے لے کر بیاہ کا دور زندگی کا سنہری دور بن جاتا ہے.....لگتا ہے زندگی واقعی بہت حسین ہے، رسوم ورواج، لین دین، ڈھولکی اور ڈانڈی، خوشیوں کا ریلہ..... رنگوں کی برسات! قہقہے اور خواب! سب کچھ حسین ہوتا ہے..... یہ سب کچھ اتنا حسین اور دلفریب لگتا ہے جتنا انتخابات سے پہلے انتخابی جلسہ اچھا لگتا ہے..... جوش، ولولہ، نعرے، جھنڈیاں، گرما گرم وعدے..... اور جلسے کے بعد تو آپ کو پتہ ہے کہ جلوس نکل جاتا ہے.....! سو ہمارے یہاں دلہن کا استقبال بڑے چاؤ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کی آمد پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جاتی ہیں، کھیر کھلائی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ نندوں کو ہاتھ دھلائی پر نیگ دیئے جاتے ہیں تو نندوئیوں کو جان چھڑائی کے نیگ دیئے جاتے ہیں۔ ساس واری صدقے جاتی ہیں، سسر شفقت سے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ دیور فرمائشیں کر کر کے پوز بنواتے ہیں، بھابی ایسے! بھابی ادھر! بھابی ادھر! (بھابی بھی سمجھتی ہے کہ وہ کسی جنت میں آ گئی ہے..... یہ میرا آشیاں..... میرا گھر! میری جنت!) مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے جو جنت میں قبل از وقت چلا جاتا ہے اسے جنت سے نکالا دے دیا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا بھی آدمؑ وحوّا نے کی تھی۔

سو جنت میں داخل ہونے والی یہ سوچتی ہے کہ وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچائی جا چکی ہے۔ وہ اپنے خوابوں کے محل میں شہزادی بن کر داخل ہو چکی ہے جہاں کے راجہ رانی سلطنت عالیہ کی ساری بادشاہی، ایک رسم تاجپوشی میں اسے سونپ کر سیر دو جہاں کے لیے نکل جائیں گے۔ محل کے سارے خدام اس کے دائیں بائیں ہاتھ باندھے پھرا کریں گے، ولی عہد سلطنت کو اس کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ ہوگی اور شہزادہ عالم ہاتھ میں گلاب کا پھول تھامے اس کے قدموں میں بیٹھے رہیں گے۔ مگر.....شادی کے بمشکل ایک ہفتے بعد ہی بہو آئینہ دیکھتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا..... جو سنا افسانہ تھا.....'' جب ہزاروں میں ایک چن کر لائی گئی بہو کی لوگ تعریفیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''آپ نے کہاں سے ایسی بہو ڈھونڈی، ایسی ہمارے لیے بھی ڈھونڈ دیجیے!''

اس تعریف سے بہو کے منہ پر جو رونق آ جاتی ہے وہ ساس ماں کا ماتھا ٹھنکا دیتی ہے.....اور جب بیٹا اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو کر سیدھے اپنے کمرے کا رخ کرتا ہے تو دماغ میں خطرے کا الارم بجنے لگتا ہے..... جب بیٹا بہو کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ''تیار ہو جاؤ، آج کھانا باہر کھاتے ہیں!'' تو دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے اس خیال سے کہ ''لو! بہو کا تو جادو چل گیا.....اب تو بیٹے کی کمائی ناز برداریوں اور چاؤ چونچلوں پر لٹے گی..... یہ بھی خیال نہ آیا کہ اپنے ساتھ بہنوں کو ہی لے جائیں!''

ادھر بہنیں یہ سمجھتی ہیں کہ ان کا استحصال شروع ہو گیا ہے چنانچہ

بہو کے خلاف فوری طور پر ایک کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے جس میں اسے قابو کرنے کے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے بیٹے کی لگامیں کسی جاتی ہیں اور اسے سمجھایا جاتا ہے کہ جورو کا غلام بننا کوئی مردانگی نہیں ہے۔ خبردار جو تنخواہ اس کے ہاتھوں پر رکھی، ابھی تمہاری ماں زندہ ہے، اسے جیب خرچ دینے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ تمہارے ابا نے کبھی ہمیں جیب خرچ دیا تھا؟ اور یہ ہر روز میکے جانے کا کیا چکر ہے؟ یہ سب گھر بسانے کے لچھن ہیں؟ نہ صبح اٹھنے کی فکر، نہ ناشتے کھانے کی پروا، نہ سینے پرونے سے واسطہ؟ بس یہیں سے گھر میں ایک سرد جنگ کا آغاز ہو جاتا ہے۔

(ان گھروں میں جہاں تعلیم و تربیت، خوف خدا، عدل و انصاف، تحمل و برداشت اور اخلاص و محبت کی کمی ہوتی ہے۔ وہاں اس آگ کو شعلہ بننے میں دیر نہیں لگتی..... چونکہ عموماً پلڑا سسرالیوں کا بھاری ہوتا ہے اس لیے اس کی زد میں بہو ہی آتی ہے۔ البتہ اب خاصی تعداد میں ایسے گھرانے بھی ہوتے ہیں جن میں بہو سسرالیوں کو تگنی کا ناچ نچا دے) اگر بہو سیدھے سادھے گھرانے سے تعلق رکھے .....(جہاں باپ بھائی کرائے کے غنڈوں سے داماد اور اس کے گھر والوں کو پٹوا نہ سکیں) تو آسانی سے اس کا سکون برباد کر دیا جاتا ہے کیونکہ نہ اس میں مزاحمت کی قوت ہوتی ہے نہ گھر والے اس سے معاونت کرتے ہیں۔

تشدد کی دو نمایاں اقسام ہوتی ہیں..... ذہنی تشدد اور جسمانی تشدد..... پہلی قسم ہمارے یہاں اتنی مقبول عام ہے کہ اسے نہ تو ہم تشدد سمجھتے ہیں نہ مانتے ہیں.....انداز بیاں کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں یا اسٹائل کے.....

غالب اس تشدد کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا! اشارت کیا! ادا کیا

سو بہو ذہنی تشدد با آسانی برداشت کر جائے تو سسرالیوں کے حوصلے مزید بڑھ جاتے ہیں اور جسمانی تشدد کا آغاز کر دیا جاتا ہے۔ کہیں جھوٹی تہمت لگا کر طلاق دی یا دلوائی جاتی ہے.....کہیں بدچلنی کا الزام لگا کر گھر بدر کر دیا جاتا ہے۔ وہی ساسیں جو مصلے پر بیٹھی اللھم اجرنی من النار کا ورد کرتی ہیں..... چولہے کا ناب دانستہ کھلا چھوڑ دیتی ہیں کہ دفعتاً آگ بھڑک اٹھے اور بہو جل جائے۔

اگر خوش قسمتی سے سسرالیوں کا تشدد میسر نہ آ سکے تو بعض مجازی خدا اس کہانی کے ہیرو خود بن جاتے ہیں۔ گالی گلوچ کر لی، مکا جڑ دیا، تھپڑ لگا دیا، گلدان اٹھا کے مار دیا، گلاس اٹھا کر نشانہ لے لیا، سگریٹ سے گردن اور بازو داغ دیئے (اپنی بیوی ہے جو چاہے سلوک کریں!) کبھی بھری رائفل چلا دی، کبھی تیز دھار آلے سے گردن اڑا دی، کبھی کلہاڑی کے وار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا..... (ایسی وارداتیں محض دیہی علاقوں تک محدود نہیں ہیں شہروں میں بھی در آئی ہیں)

کچھ شوہر حضرات اپنی خوبصورت اور تعلیم یافتہ بیوی کو اپنی کامیابی کے لیے بطور زینہ استعمال کرتے ہیں۔ دوستوں کے سامنے جانے اور چائے پیش کرنے کا حکم دیتے ہیں انکار پر ان کی درگت بنا دیتے ہیں۔ نو بیاہتا کے ناک کان اور ہونٹ کاٹنے کی خبر آپ نے بھی پڑھی ہوگی.....(ایسی خوبصورت بیوی کا کیا فائدہ کہ صاحب دوست کی داد سے بھی محروم رہیں!) آج کل ماڈرن فیملی میں ڈانس پارٹی کا بھی خوب رواج ہے اب ایسی فیملی میں کوئی نیک پروین بہو آ جائے اور امراؤ بننے سے انکار کر دے تو اس کی چوٹی کاٹ کے ہاتھ پر رکھ دی جاتی ہے اور اس کا پارٹی ٹکٹ منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ (جو شوہر کے اشاروں پر نہ ناچے وہ بیوی ہی کیا!) آج کل گھیراؤ اور جلاؤ کا زمانہ ہے..... (ایک زمانہ تھا کہ چند تصویر بتاں! چند حسینوں کے خطوط! ہی جلائے جاتے تھے) سوٹائر جلاؤ، دکان جلاؤ، مکان جلاؤ کے ساتھ ساتھ بیوی جلاؤ اور بہو جلاؤ مہم بھی عوام میں بڑی مقبول ہو رہی ہے (اور اس کے پیچھے

کسی ایجنسی کا ہاتھ ہے نہ.....) تو ہوتا یہ ہے کہ ادھر شادی ہوئی (خواہ لو میرج ہو یا ارینج) ادھر تنازعات نے جنم لے لیا۔

ادھر تنازعہ بڑھا ادھر بیوی ناراض ہو کر میکے آ بیٹھی کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں گے مگر.....مصالحت کے بہانے گھر آئے، ایک دو میٹھی باتیں کیں، لگاوٹ سے کہا کہ آؤ! ذرا قریبی پارک چلتے ہیں، تم بھی فریش ہو جاؤ گی.....(میاں کو راہِ راست پہ آتا دیکھ کر ظاہر ہے کہ بیوی ایک دفعہ پھر اس پر اعتبار کر کے اس کے ساتھ چلتی ہے) میاں صاحب پارک میں موجود ایک درجن افراد کے سامنے بیوی پر تیل چھڑک کر آگ لگا دیتے ہیں..... (ہونہہ! بڑی اکڑ دکھا رہی تھی.....سمجھ رہی تھی میں بنتی کر کے گھر لے جاؤں گا کہوں گا تمہارے بغیر گھر بڑا سونا ہو گیا ہے.....) دراصل ہمارے یہاں تفریح طبع کا کوئی سامان بھی تو میسر نہیں (کبھی سامان کی قوت خرید نہیں ہوتی، کبھی جہالت سوچ کو محدود رکھتی ہے، کبھی روایت آڑے آ جاتی ہے) نہ جگہ جگہ ایسے تھیٹر اور سینما گھر ہیں کہ فیملی کو لے جایا جا سکے۔ نہ ہر علاقے میں کتب خانے اور سیر گاہیں ہیں، نہ گھوڑ سواری ہے، نیزہ بازی ہے، نہ باغبانی ہے، نہ گلہ بانی ہے، نہ شہروں میں گائے بکری پالنے کا رواج ہے کہ ان کی دیکھ بھال اور 'چارہ جوئی' میں لگے رہیں، سو لے دے کے قسمت کی ماری بہو یا بیوی ہی رہ جاتی ہے جسے تختہ مشق سمجھ لیا جاتا ہے۔

جب تک شادیاں دنیاوی مفاد کے لیے کی جاتی رہیں گی ہمارے رویوں کا یہی حال رہے گا۔ روشن خیالی، باہر کھانا کھانے، ویلنٹائن ڈے منانے، جینز اور اسکرٹ پہننے تک محدود رہے گی۔ جب تک شوہر بیوی کے معاملے میں اتنا روشن خیال نہ ہو جائے جتنا اللہ اسے حکم دیتا ہے ''وعاشروھن بالمعروف'' یعنی بیوی کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی گزارو۔ تب تک بہو کے لیے سسرال عقوبت گاہ ہی بنا رہے گا خواہ اسے تحفظ دینے کے لیے کتنی ہی قانون سازی کی جائے۔

☆☆☆☆

چلتے چلتے

قارئین محترم کی خدمت میں ہمارا سلام پہنچے۔ دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد آپ کی ضیافت طبع کا ساماں کرنے چلے ہیں..... اقبال کے الفاظ میں

کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا چلنا مدام چلنا

چلتے چلتے بھی چلتا ہی جا رہا ہے..... بس کبھی کبھار کوئی روڑا، کوئی پتھر، کوئی جھاڑی، کوئی کھڈا راہ میں آ ہی جاتا ہے اور لاہور کی سڑکیں تو آپ جانتے ہیں عرصہ دراز سے کہیں نہ کہیں سے ٹٹ پنج کا شکار ہیں۔ ایسے میں کبھی ہماری رفتار ذرا ماٹھی پڑ جائے تو گھبرایا نہ کریں۔ آپ کے ساتھ ساتھ ماڑے چنگے چلتے ہی جائینگے جب تک رب رحمٰن ورحیم نے چلایا۔

جناب زرداری صاحب نے وہ گیا کہ اب گیا کے حالات و خدشات تلے اپنی حکومت کے چار سال پورے کر کے پارلیمنٹ سے خطاب فرما ہی لیا مگر اس حالات میں کہ اپوزیشن کا احتجاج واک آؤٹ ''گو زرداری گو''..... ''لوٹ مار بند کرو''..... ''قوم کے پیسے واپس کرو'' کے نعرے بھی لگتے رہے مگر صدر صاحب خوش ہیں اور اس اعزاز پر پھولے سے نہیں سما رہے کہ وہ ایک ہی پارلیمان سے 5 بار خطاب کرنے والے پہلے صدر ہیں۔ حالانکہ ان کے نامہ اعمال میں اور بھی بہت سے اعزازات رقم ہو چکے ہیں جن پر نہ احساس شدت نہ داغ ندامت اور تو اور ان کی کرسی نے بھی الٹ کر انہیں زبان حال سے یہ پیغام دیدیا کہ میری اور قوم کی جان چھوڑیں اور اپنا وجود مسعود ہم پر مزید مسلط نہ کریں۔ مگر کوئی سنے تو اس کا پیغام..... کوئی سمجھے تو اس کی زبان اور صاحب! خطاب کیا تھا وہی نام نہاد کامیابیوں کا ذکر..... ناکامیوں کا حوالہ تک نہیں..... اپنے وزیراعظم کی سیاسی بصیرت و جرات کو خراج تحسین..... حالانکہ جتنی ان میں بصیرت ہے سب جانتے ہیں بلکہ پتہ پتہ بوٹا بوٹا جانتا ہے ہاں صرف ایوان صدر میں سجا گل دان نہیں جانتا..... اخبارات کے مطابق صدر نے خطاب میں غلط معاشی اعداد و شمار پیش کے۔ چلیے خطاب تو ہو گیا اور ہاں وزیراعظم صاحب نے پچھلے دنوں خوشی سے فرمایا تھا کہ ایک عورت نے میری شہادت دی۔ اسی طرح صدر کے خطاب میں بھی فردوس عاشق صاحبہ نے احتجاجی پوسٹر پھاڑ کر حق خدمت بلکہ حق وزارت ادا کیا۔ گویا یہاں بھی عورت ہی نے ساتھ دیا اور وہ ساتھ بھلا کیوں نہ دیتیں۔ عاشق جو ہوئیں..... سچ ہے عشق نہ پچھے ذات! اور یہاں پر تو عاشق صاحبہ نے نہ خطاب پوچھا نہ حساب پوچھا بس منصب ہی پوچھا کہ چونکہ صدر صاحب تھے لہٰذا ان کی حمایت میں اچھل کود کرنی ہی کرنی تھی اس میں کسی حیرت، مسرت، فرحت یا شجاعت کی کیا بات ہے۔

تو آیئے! اب چند خبروں کی طرف چلتے ہیں۔

''امریکہ کو ملک کیخلاف منصوبے بنانے والے شہریوں کو قتل کرنے کا حق ہے۔ القاعدہ سے منسلک امریکی دنیا کے کسی کونے میں ہوں انہیں نشانہ بنانا درست ہے: اٹارنی جنرل ایرک ہولڈر''

جو القاعدہ سے منسلک ہو گئے وہ آپ کے کہاں رہے بادشاہو! گویا یہ بیان بھی ہیر پھیر کر مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ہی جاتا ہے..... ویسے سوچنے کی بات ہے کہ یہاں ملک کے خلاف محض منصوبہ سازی کرنے والوں کو قتل کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے اور جو درندہ صفت کسی دوسرے کو عذاب دیتے ہیں گوانتانا موبے اور ابوغریب جیسی جیلوں میں ایسا تشدد کرتے ہیں بے قصور قیدیوں پر ان کے سینے

میں دل کی جگہ پتھر کا گماں گزرنے لگے.....تو ایسی مہذب حملہ آور فوج اور اس کے سربراہ وصدر کے بارے میں کیا خیال تھے، ان کے لیے کیا سزا ہونی چاہیے، غالبا ایک بار قتل کرنے کی سزا تو نہایت ہلکی رہے گی۔ لینے اور دینے کے پیمانے الگ الگ کرنے والے اس خوانخوار دشمن کی سزا..... سچی بات ہے ہم لوگ تجویز ہی نہیں کر سکتے عصر حاضر کے اس فرعون کے ہم رب قدیر وقہار کے اوپر چھوڑتے ہیں اور جو اس کی رگ رگ سے واقف ہے اور اس کی تمام چالبازیوں سے آگاہ بھی۔

ریمنڈ ڈیوس سمیت ان کی طرف سے مسلمانوں پہ کوئی ظلم وستم روا رکھ سکتا ہے کیونکہ یہ وڈی سرکار جو ہوئے۔ گلوبل چوہدری جو ٹھہرے۔ ابھی پچھلے دنوں 16 افغانوں کو ایک امریکی فوجی نے بھون کر رکھ دیا اب اسے بچانے کیلئے جواز یہ پیش کر رہے ہیں کہ اسے بھولنے کا مرض لاحق ہے..... واہ کیا کہنے تیرے..... سچ ہے جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے..... ایک شاعر کا یہ شعر کیسا بیٹھتا ہے آپ کے مزاج ونفسیات پر۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

''امتحانات کیلئے آن لائن سسٹم ناقابل عمل قرار: ہائیکورٹ کا پنجاب کے تمام بورڈز میں مینول طریقہ بحال کرنے کا حکم، 18 گھنٹے لوڈشیڈنگ سے آن لائن سسٹم کیسے چل سکتا ہے؟''

وہ کیا کہتے ہیں.....

اک ڈاھیا، ڈاھیا/ ڈھاکے بنایا/ بنائے کو پھر ڈھایا

کچھ ایسا ہی حساب ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ ارباب اقتدار فیصلے کرتے ہیں غاصبانہ یا فاضلانہ تو کچھ عرصہ بعد ان ہی فیصلوں کو بدل دیتے ہیں..... زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ انہی فیصلوں پر پھر نظر ثانی کر کے کوئی اور فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی کی رفتار آگے کی بجائے پیچھے کی طرف رہتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ فیصلے آتے وقت زمینی حقائق سے چشم پوشی کیوں کر ہو جاتی ہے۔ ہمارے خادم اعلیٰ (یہ لقب ان کا اپنا اختیار کردہ ہے حالانکہ خادم..... خادم ہوتا ہے.....

اس میں اعلیٰ یا ادنیٰ کا کیا سوال؟) بڑے متحرک، بڑے متفکر، بڑے مفکر اور بڑے سنگر بھی ہیں۔ منصوبے نہایت شاندار بناتے ہیں..... سنگ بنیاد اتنے زیادہ رکھتے ہیں کہ بنیاد ہی ہلنے لگ جائے۔ کسی طرف مراعات وثمرات کی بوچھاڑ اور کسی طرف کوئی ادارہ افلاس وقحط سے دوچار۔ دانش سکولوں کی مثال سامنے ہے اتنے اعلیٰ معیار کی عمارات و سہولیات کی بجائے درمیانہ کام کیا جاتا اور وہی رقم سرکاری سکولوں کی عمارات وسٹاف کی بہتر نگہداشت کیلئے مختص کر دی جاتی تو کیا مضائقہ ہوتا..... اسی طرح سستی روٹی سکیم پر اربوں لگا دیئے اس سے کہیں بہتر تھا کہ مہنگائی کو ذرا قابو کرنے میں سنجیدہ کوشش کی جاتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وفاقی اور صوبائی ہر حکومت کی اولین ترجیح بجلی پیدا کرنے پر..... اس بحران کو حل کرنے پر ہونی چاہیے تھی کہ اسی سے دوسرے تمام منصوبے جاری وساری رہ سکتے ہیں۔ بجلی مہنگی سے مہنگی کرتے چلے جانا مسئلے کا کوئی حل نہیں بلکہ مزید مسائل کو پیدا کرنے کا سبب ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ آئندہ کا مورخ ہمارے اس عہد اور ہمارے عہدے داروں کے بارے میں کیا رقم کرے گا۔ اتنے بچگانہ فیصلے.....؟ عوام دشمنی کے ایسے حربے؟ بھارت..... اپنے ازلی دشمن کے ساتھ محبت کی ایسی پینگیں.....؟ مال بنانے کے دن دیہاڑے کارنامے.....؟ وفاقی وزیر مذہبی امور نے سینٹ کے ایک ایک سیٹ کئی کروڑ میں پڑنے کا بیان دیا ہے۔ سوئس کیس الگ ہماری حالیہ تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہے اور یوسف رضا گیلانی صاحب اپنے نت نئے بیانات بلکہ ہٹ دھرمی سے اس جھومر میں اپنی طرف سے شاید ہیرے موتی ٹانک رہے ہیں جبکہ دراصل وہ اپنے سیاسی تابوت میں خود ہی کیل ٹھونک رہے ہیں..... زرداری صاحب نے تو اپنے خطاب میں جو رائے رکھتے ہیں وہ آئے دن کے باہمی ایس ایم ایس واضح کرتے رہتے ہیں۔ ایسا بھی ایک پیغام ملاحظہ فرمائیے

زرداری بھی لے لو، رحمانی بھی لے لو
الطاف، فضل اور حقانی بھی لے لو
بھلے چھین لو ہم سے اپنا گیلانی

مگر ہم کو لوٹا دو قیمت پرانی
وہ آٹا وہ چینی، وہ بجلی وہ پانی
بڑی مہربانی، بڑی مہربانی

''9/11 کے بعد امریکہ میں مساجد کے قیام میں 74 فیصد اضافہ، 2011ء میں 50 امریکی ریاستوں اور ڈسٹرکٹ کولمبیا میں تعداد 2106 ہو گئی: سروے رپورٹ''

واہ سبحان اللہ گویا
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دو گے

نہ صرف مساجد میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ اسلام قبول کرنے والوں میں بھی خوشگوار اضافہ جاری وساری ہے اور ہماری نومسلم بہن ایوان ریڈلی دشمنان اسلام پر کافی بھاری ہے۔ ابھی تو ہم مسلمان اپنے اخلاق واعمال کے لحاظ سے کبھی صحیح مسلمان بن جائیں تو پھر اسلام کی اشاعت وفروغ دیکھیے گا۔ مسجد کا اسلامی معاشرے میں ایک اہم کردار ہے۔ اگر مسائل کے آئمہ کرام قرآن وسنت پر چلتے ہوئے اپنے فرائض دیانتداری سے ادا کرتے ہوئے اپنے خطبے فرقہ واریت کو ہوا دینے کی بجائے اخوت ومحبت سے لبریز، اسلام کی سچی تصویر کے عکاس پیش کریں تو ماحول میں فی الفور مثبت تبدیلی آسکتی ہے۔ ہم خواتین بھی اپنے گھروں میں..... اپنے بچوں پہ محنت کریں تو ہمارے لیے صدقہ جاریہ تیار ہوسکتا ہے۔

''منزل واٹر کے 74 میں سے 20 برانڈ انسانی صحت کیلئے مضر پائے گئے۔''

ایک سرکاری تحقیقات رپورٹ کے مطابق ان بوتلوں میں بند پانی مہلک بیماریاں جن میں کینسر، ہیپاٹائٹس، امراض قلب، امراض جگر، ہیضہ، بلڈ پریشر اور ڈائریا کا سبب بن سکتا ہے..... صحت سے ہی متعلق ایک اور خبر ملاحظہ فرمائیے!

''درآمدی خوراک سے امریکہ میں بیماریاں بڑھ گئیں۔''

اس کی وجہ 10-2009ء کے درمیان غذائی درآمدات ہیں۔ جن میں سب سے بڑا حصہ مچھلی اور مصالحے ہیں۔

بے ایمانی اور ملاوٹ تو گویا ہماری گھٹی میں پڑی ہے..... منرل واٹر کے نام پر عام سادہ پانی بلکہ آلودہ پانی کہنا چاہیے بوتلوں میں بند کر کے خوش رنگ لیبل لگا کر بظاہر پیسے کما رہے ہیں مگر حقیقت میں دوزخ کا سامان کر رہے ہیں۔ ویسے تو ڈاکٹر ابلا ہوا پانی سب سے بہتر قرار دیتے ہیں لہٰذا ہمیں تھوڑی سی محنت کر کے پانی خود ابال لینا چاہیے اور بازار کے بوتل بند پانی خریدنے سے گریز کرنا چاہیے۔ بچت کی بچت اور صحت کی صحت۔ اسی طرح بازاری مصالحہ جات اور بازار کے پکے ہوئے کھانے مضر صحت ہوتے ہیں۔ ذرا سے چٹخارے کیلئے صحت و رنگت کو دواؤ پہ کیوں لگایا جائے۔ جان ہے تو جہان ہے..... اور صحت ہے تو اس جہان کا ارمان ہے..... دل چسپی کا سامان ہے..... صحت نہیں تو سب کچھ ویران ہے..... لہٰذا صحت کی اور اپنے ایمان وعمل کی حفاظت کیجیے کہ یہ بڑی گرانمایہ چیزیں ہیں..... اور سادگی کو رواج دیجیے ہر شعبہ حیات میں سادگی جہاں اچھی صحت کی ضامن ہے وہاں بچت بھی خوب ہوگی پیسے میں بھی..... وقت میں بھی اور سکون بھی وافر ملے گا۔ دنیا کے پیچھے دوڑنے سے کیا حاصل؟ یہ اور آگے آگے بھاگے گی..... ہاتھ نہیں آئے گی اس لیے صرف نظر کرلیں۔ اسے ٹھوکر ماردیں..... اس کی محبت دل سے نکال دیں..... یہ آپ کے قدموں پہ لوٹ پوٹ ہوگی..... یہ بات ہم نہیں کر رہے، ایک حدیث نبوی کا مفہوم ہے۔

☆''مضبوط ترین وزیراعظم ہوں..... اب وزیراعظم اندر جائے گا نہ باہر جائے گا اور نہ اوپر جائے گا۔''

☆''خط نہیں لکھوں گا..... توہین عدالت کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں وہ مجھے وزیراعظم نہیں چپڑاسی سمجھتے ہیں۔''

☆''سوئس حکام کو خط لکھنے سے وزیراعظم کا پھر انکار..... بنچ پر عدم اعتماد..... میری قسمت کا حتمی فیصلہ کرنے والے عوام ہیں، صدر کو غیر ملکی مجسٹریٹ کے سامنے نہیں پھینکا جاسکتا: وزیراعظم گیلانی۔''

یہ تو اس دیگ کے چند دانے آپ کو دکھائے ہیں ورنہ تو حالات حاضرہ سے باخبر رہنے والے بخوبی جانتے ہوں گے کہ ان

دنوں گیلانی شاہ کس غضب کے ایک سے ایک خوبصورت بیان داغ رہے ہیں۔اس دیگ کے نیچے آگ جلانے یا لگانے کیلئے معمور ہیں اعتزاز احسن صاحب۔ یہ بابر اعوان صاحب کی جگہ بھٹی سلگانے یا بھڑکانے پہ اپنا سارا زور بیان لگا رہے ہیں۔

سوئس حکام کو خط لکھنے سے انکار کا معاملہ کچھ اسی شد و مد سے اٹھایا ہے شاہ صاحب نے کہ بڑے تو بڑے بچے بھی حیران ہیں کہ آخر خط لکھنے میں مضائقہ ہی کیا ہے۔جس ملک کے وزیراعظم ہیں انہیں اس کی بقا.....اس کی وفا عزیز ہونی چاہیے نہ کہ ذاتی اغراض ومفاد اور ریاستی دوستی.....سیدھی سی بات ہے کہ بڑے سے بڑے عزیز دوست سے بھی زیادہ اپنا گھر اور اپنی گھر والی عزیز ہوتی ہے۔ چلیے قوم کی خاطر نہ سہی.....ملک کی خاطر نہ سہی کم از کم اپنی اہلیہ محترمہ کے لیے ہی کچھ خیال کریں اور خط لکھ دیں۔اللہ تعالیٰ نے خاتون اول بنا بھی دیا ہے تو انہیں ایک سال اور اس مسند پہ فائز رہنے دیں مگر یوسف ثانی کو اس کی بھی پرواہ نہیں اور لنگر لنگوٹ کس کر زرداری صاحب کی پشت پہ کھڑے ہیں کہ کوئی انہیں ہاتھ تو لگا کر دیکھے..... جناب یوسف رضا گیلانی صاحب! ذرا اندرون خانہ بھی جھانکیے اور بیگم صاحبہ کی رضا بھی معلوم کیجیے ایسا نہ ہو کہ بے قراری اور اضطراب میں وہ کسی اور سے ایک خط لکھوا دیں جو کچھ اس طرح کے نفس مضمون کا حامل ہو سکتا ہے۔

چٹھی ذرا چیف جی کی نام لکھ دے
حال میرے دل کا تمام لکھ دے
لکھ دے کہ شاہ جی کی بڑی مجبوری ہے
کہ صدر جی کے سنگ رہنا بڑا ہی ضروری ہے
کہتی ہوں میں خط لکھوں، مارتا وہ گھوری ہے
بولتا ہے جھوٹ صبح و شام لکھ دے
چٹھی ذرا چیف جی کے نام لکھ دے
یوں مینڈھے سائیں کو مجھ سے بڑا پیار ہے
پھر بھی خط لکھنے سے ڈھڈا اوازار ہے
آصف کی لٹ مار کا اسے بھی اقرار ہے
آنے کو ہے غموں کی اب شام لکھ دے
چٹھی ذرا چیف جی کے نام لکھ دے
لکھ دے کہ فوزیہ کا دل بے قرار ہے
اکھیوں میں آنسو اور سینہ داغ دار ہے
کہ وزیراعظم ہونے کا مزا بے شمار ہے
مانگتی ہوں معافی میں، سلام لکھ دے
چٹھی ذرا چیف جی کے نام لکھ دے

☆☆☆☆

منافقت

بیماری کو مان لینے کے بعد ہی اس کا علاج یکسوئی سے کیا جاسکتا ہے۔ضروری ہے کہ اپنے اندر جھانک کر دیکھیں۔

ہر انسان کو یہ زعم ہے کہ وہ منافق نہیں ہے.....اور ہر انسان کو دوسرے سے یہ شکوہ ہے کہ لوگ منافق ہیں۔

ہم اپنی رائے کو مقدم جانیں یا دوسروں کی، بہر حال منافقت کی زد میں آتے ہی ہیں۔عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے۔اسی لیے ہم اپنی منافقت کو حکمت و مصلحت کا خوب صورت لبادہ اوڑھا دیتے ہیں اور دوسروں کی حکمتوں اور مصلحتوں کو بے لباس سمجھتے ہیں۔

اپنی چالاکی، عیاری کو عقل مندی، ہوشیاری، فراست کا نام دیتے ہیں۔دوسروں کی سمجھداری کو تسلیم کرنے پہ دل آمادہ ہی نہیں ہوتا۔

دوسروں پہ تنقید، اعتراض کو خیر خواہی کا نام دے کر دل کی جلن پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ اپنے بارے میں کسی کی طرف سے خیر خواہی کو بھی عداوت کا نام دیتے ہیں۔

دنیاداری کے تقاضے جانتے ہوئے سارے مکروہ عزائم پورے کر لیتے ہیں۔دوسروں کی دنیاداری پر ہر طرح کی تنقید اپنا فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔

تقویٰ کے پیمانے ہماری نظر میں اپنے لیے کچھ اور ہوتے ہیں، دوسروں کے تقویٰ کو ہم کسی اور پیمانے سے ناپتے ہیں۔

ہم جب بااختیار ہوتے ہیں تو اپنے فرائض اور حقوق کی لسٹ اور طرح کی بناتے ہیں۔دوسرے بااختیار ہوتے ہیں تو ان سے کچھ اور توقعات وابستہ کرتے ہیں۔

ہم دوسروں کا دل دکھا کر ان سے محبت کی توقع رکھتے ہیں۔ جب ہمارا دل دکھے تو ہم انتقام اور بدلے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔

یہ اور اس طرح کے بے شمار تضادات معاشرے کو وہ سکون مہیا نہیں کر سکتے جو انسانی معاشرے کا خاصہ ہونا چاہیے۔دو لوگوں کا معاملہ ہو، دو خاندانوں کا یا دو قوموں کا، یہی منافقت اور تضادات فساد اور باہمی نزاع کا باعث ہیں۔جہاں بھی مفادات کا ٹکراؤ ہوگا حقوق و فرائض کا معاملہ ہوگا، یہی دوغلی پالیسی اور منافقت دوری کا باعث ہوگی۔

دل میں کچھ اور منصوبے ہیں، زبان پہ کچھ اور باتیں ہیں۔ بصارت اور بصیرت کا ٹکراؤ ہے۔دل اور دماغ کی جنگ ہے۔حق و باطل کی کشمکش ہے۔حقوق و فرائض کا جھگڑا ہے۔ہم معاشرے میں امن و سکون کا ذریعہ بننا چاہتے ہیں تو ہمیں خود کو بدلنا ہوگا، اگر منافقت ہے تو اس کو تسلیم کرنا ہوگا۔بیماری کا تعین کرنے کے بعد ہی اس کا علاج یکسوئی سے کیا جا سکتا ہے۔بیمار انسان اس بات کا منتظر نہیں رہتا کہ دوسرے بیمار بھی صحت مند ہو جائیں گے تو پھر وہ بھی اپنا علاج شروع کرے گا۔

ہم اپنے اندر جھانکیں، دل کی باتوں پہ کان دھریں، ملامت کرنے والے نفس کی بات سنیں، ضمیر بہت اچھا استاد، بہت پیارا دوست ہے۔یہ منافق نہیں ہے جو بھی کھری اور سچی بات ہے اسی کی طرف سے ہے۔اگر نفس لوامہ سے ہاتھ چھڑایا تو نفس امارہ ہاتھ پکڑ لے گا۔انسان کو لازماً کسی نہ کسی کا ہاتھ چاہیے ہوتا ہے۔بغیر سہارے وہ نہ جنت میں جاتا ہے اور نہ دوزخ میں۔ اب فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ کس کا ہاتھ تھامنا ہے۔نفس لوامہ کی صحت کمزور ہو جاتی ہے جب انسان اسے اپنے سے دور کر لیتا ہے اور پھر نفس امارہ خوب تنومند ہونے لگتا ہے۔نفس امارہ،

منافقت کی کھیتی کو پانی دیتا ہے، اور منافقت نفس امارہ کی احسان مند ہوتی ہے۔

حکایات سعدی میں درج ہے ''ایک بزرگ سے میں نے پوچھا، اس بات کے کیا معنی ہیں کہ تیرے دشمنوں میں سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے اندر ہے۔''

انہوں نے فرمایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اگر تو دشمن پر احسان کرے تو وہ تیرا دوست بن جاتا ہے۔لیکن اپنے نفس امارہ سے جس قدر نرمی کرے وہ زیادہ دشمنی کرتا ہے۔یعنی تجھے خدا سے غافل کر دیتا ہے۔''

عقل مند سب سے زیادہ اپنی ذات کا خیر خواہ ہوتا ہے۔اور اپنی ذات کے ساتھ خیر خواہی، اسی صورت میں ممکن ہے جب اس پہ کڑی نگاہ رکھی جائے۔ ہر کام سے پہلے اور ہر عمل کے بعد اپنے آپ کو کڑی تنقید سے گزارنے والے دوسروں کی ناقدانہ نظروں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔اپنی خواہشات نفس پہ سخت پہرہ رکھنے والے ہی شیطان کی دخل اندازی اور اس کی طرف سے پھیلائے ہوئے شر و فساد سے مامون رہ سکتے ہیں۔نفس امارہ ایسا درندہ ہے جس کے ساتھ رہنے سے تکلیف اور آزار کا خطرہ کم نہیں ہوتا۔جو نفس امارہ کو کنٹرول میں رکھتا ہے امن میں رہتا ہے۔

آیئے ایک بار پھر جائزہ لیں۔

☆.....ہم جن کو مصلحتیں، حکمتیں گردانتے ہیں، کیا اللہ تعالیٰ کی نظر میں بھی وہ اتنی ہی مصلحت و حکمت ہوگی؟

☆..... رخصت اور عزیمت کے معیارات کے در پردہ کہیں ہماری منافقت تو کوئی گل نہیں کھلا رہی؟

☆.....تقویٰ کے جو معیار ہم نے وضع کر رکھے ہیں کیا قرآن پاک کی کسوٹی پر وہ پورے اترتے ہیں؟

☆..... بندوں اور اللہ سے کیے جانے والے وعدوں، مستقبل کے ارادوں، منصوبوں میں قلب و زبان ہمنوا ہیں؟

☆.....کیا معاشرے کی اصلاح کے لیے ہم نے جو اصول و قواعد اور منصوبے بنا رکھے ہیں وہ ہمارے اوپر بھی اتنے ہی لاگو ہوتے ہیں جتنے کہ دوسروں پر؟

پتہ نہیں ہم جانتے ہوئے بھی ان جان کیوں ہیں؟ انسانی سرشت کیسے اپنا نظریہ بدل لیتی ہے..... کہ کل جو دوسروں کے ساتھ برا ہوا، وہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہے، لیکن آج جو ہمارے ساتھ برا ہو رہا ہے تو یہ دشمنوں کی سازش ہے۔

ہمیشہ دشمن تو ایک ہی ہے اور سازش بھی وہی کر رہا ہے۔ دشمن کو دشمن نہ سمجھنا بھی حد درجہ کی منافقت ہے۔گھر ہوں یا ملک، دشمن اور دوست کی تمیز کوئی کرنا ہی نہیں چاہتا..... گھر برباد ہو رہے ہوں تو کس کا قصور ہے؟ گھر کا سربراہ بااختیار ہے، وہ جس کو چاہے قصور وار ٹھہرائے حالانکہ وہ سب کچھ جانتا ہے، لیکن اختیارات کا نشہ ہے۔ ملک برباد ہو رہا ہے تو عوام کا قصور ہے۔ بے چارے کمزور بے اختیار لوگ، ظلم بھی سہیں اور قصور بھی تسلیم کریں۔ وہ ظالم ہو کر بھی ظلم سے بری ہے۔ بے وفا ہو کر بھی وفادار کہلاتا ہے۔عوام سے بے وفائی ہے، اپنے آقاؤں سے غیروں سے وفاداری ہے۔ یہ تو منافق ہی کو زیب دیتا ہے کہ وہ جب چاہے جس کے سامنے چاہے اپنی وفائیں پیش کرے۔ بحیثیت مومن زندگی جینا ہے تو پھر دل کو ایسا بنانا ہوگا کہ دل کو ہتھیلی پر رکھ کر بازار میں گزرا جائے تو اس شیشے میں کوئی بال نہ آیا ہوا ہو۔ صاف و شفاف آئینہ، صحیح سالم دل جس کو قلب سلیم کہا جاتا ہے۔ جب حشر کا میدان ہوگا انسان کے کام کوئی نہ آئے گا۔ نہ مال نہ اولاد، نہ حسب نسب نہ اختیارات۔

الا من اتی اللہ بقلب سلیم

☆☆☆☆

خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

ہستی کی محبتوں کو خراج پیش کرنا ہے۔ٹوٹے الفاظ ہی سہی، ناپختہ انداز بیاں ہی سہی مگر کیا کروں گواہی بھی تو دینی ہے۔آج اگر میں یہ چند الفاظ لکھنے کے قابل ہوں تو اسی ہستی کی توجہ اور محبت کی وجہ سے جس کی زندگی کا سفر شاید اس لیے خوبصورت تھا کہ اس کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کے لیے وقف تھا۔ وہ تو ایک سورج تھا جو ڈوب گیا، ایک شمع تھی جو بجھ گئی۔

داستاں گوئی میری نہ کام آسکی
اس قدر منفرد تھی کہانی تیری

قانون قدرت ہے کہ لوگ پیدا ہوتے ہیں اور اپنی مدت مکمل کر کے واپسی کا سفر اختیار کر لیتے ہیں۔ان کی اکثریت تو اس زمین کا بوجھ ہے مگر کچھ پاکیزہ نفوس پہاڑی کے چراغ، زمین کا نمک ہوتے ہیں۔ایسی ہی واپسی اللہ کے ایک بندے نے اختیار کی۔ضلع گجرات، تحصیل کھاریاں کے گاؤں چنن میں 1907ء کو آنکھ کھولنے والا اللہ کا ایک بندہ 2007ء کو سو سال کا سفر مکمل کر کے اپنے آقا سے ملاقات کے لیے بلا لیا گیا۔اناللہ وانا الیہ راجعون

یہ پاکیزہ تذکرہ ہے میرے دادا جان مرحوم، مولانا غلام سرور صاحب کا، جن کی ساری زندگی اللہ کے راستے میں جدوجہد سے عبارت تھی نہ صرف جوانی بلکہ بڑھاپا بھی قابل رشک۔ اس عظیم انسان نے شروع دن سے ہی اپنی زندگی کا ایک مقصد بنایا اور کئی بار مجھے سنایا۔

اخراج العباد من عبادۃ العباد الی عبادۃ رب العباد

یعنی بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی میں داخل کرنا۔ وہ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ حافظ قرآن بھی تھے۔ پوری زندگی صلاۃ التراویح میں قرآن سنانا معمول رہا۔آخری چند سالوں میں کمزوری کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے تو سامع بن کر قرآن سنا اور جب مسجد جانا مشکل ہو گیا تو گھر میں اپنے پوتوں حافظ محمد ابوذر اور محمد ابراہیم سے صلاۃ التراویح میں بیٹھ کر قرآن سنا۔ قرآن کے ساتھ شدید محبت تھی۔بغیر کسی معاوضہ کے قرآن وحدیث کی تعلیم کو عام کرنا ان کی زندگی کا مشن رہا۔ان بچوں سے بہت محبت تھی جو قرآن وحدیث کو سیکھنے کا شوق رکھتے تھے۔عربی گرائمر سیکھنے پر بہت زور دیتے تھے۔فرماتے تھے کہ عربی گرائمر سیکھے بغیر قرآنی الفاظ کا گہرائی کے ساتھ اصل مطلب ومقصود سمجھنا بہت مشکل ہے۔

تقریباً ایک صدی تک اپنے علاقے کے لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کا پیغمبری فریضہ ادا کرتے رہے اور اپنے پیچھے سینکڑوں شاگرد چھوڑے ہیں جن میں اکثریت طالبات (خواتین) کی ہے۔قرآن میں ڈوب کر پڑھنے کا یہ عالم ہوتا تھا کہ عصر اور مغرب کے درمیانی وقت میں تلاوت قرآن ان کا معمول تھا۔کبھی میں پاس بیٹھی ہوتی تو تلاوت کے دوران ایک ٹھنڈی آہ ان کے سینے سے نکلتی اور کہتے آہ ہا عمر گزر گئی مگر قرآن کی سمجھ اب آنی شروع ہوئی ہے میں حیران ہوتی کہ اس انسان کی تو عمر ہی قرآن پڑھتے پڑھاتے گزری ہے اب یہ کیا کہہ رہے ہیں؟تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔1984ء میں مسجد سے ملحق ایک کمرے میں باقاعدہ ایک مدرسہ قائم کیا جس کا نام ''مدرستہ تعلیم الاسلام للبنات'' رکھا۔ چونکہ جگہ کم تھی اس لیے ہر وقت انہیں یہ فکر رہتی کہ کچھ زمین حاصل کر کے باقاعدہ بڑی عمارت بنائی جائے تاکہ

علاقے کی اکثریت اپنی بچیوں کو قرآن وسنت کی تعلیم سے آراستہ کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس جذبہ صادقہ کی قدر کرتے ہوئے خوابوں کی تعبیر عطا فرمائی تو بہت خوش ہوئے اور مجھے یوں لگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بوڑھے انسان کو پھر سے جوان ہمت بنا دیا ہے انہوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک کنال سے زیادہ رقبے پر تعمیر کے بعد طالبات کے لیے ہوسٹل کی سہولت کے ساتھ تعلیم کا آغاز کر دیا۔

اس دوران ایک دن زیر تعمیر مدرسہ کے سامنے ٹرک سے اینٹیں اتروا رہے تھے کہ علاقے کا کوئی معزز آدمی پاس سے گزرا وہ سمجھا شاید مولوی صاحب اپنا گھر تعمیر کروا رہے ہیں۔ اس کے تعجب اور استفسار پر اپنے ارادے اور مدرسے کے قیام سے جب آگاہ کیا تو وہ آدمی کہنے لگا، مولانا صاحب پروگرام تو بہت اچھا ہے لیکن ''وقت عصر ہو چکا ہے۔ (یعنی اب آپ بوڑھے ہو گئے ہیں) جواباً فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا وقت عصر بھی اللہ کے راستے میں اور اس کے دین کو پھیلانے میں گزرے اور میں اسی حالت میں اپنے رب سے ملاقات کے لیے حاضر کیا جاؤں۔

دادا جان نے جب طالبات کیلئے دینی مدرسے کا آغاز کیا تو اس وقت تک جماعت اسلامی کے پاس دینی مدارس نہیں تھے۔ انہوں نے ذمہ داران کو وقت کی اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا۔ پھر جب منصورہ میں جامعہ المحصنات کا قیام عمل میں آیا تو انہوں نے اپنے مدرسے کا الحاق رابطہ المدارس منصورہ کے تحت مولانا عبدالمالک کی سرپرستی سے کر دیا۔ سالانہ امتحان و اسناد وغیرہ کا اجراء وہیں سے ہونے لگا۔ رابطہ کے امتحان کی شرائط میں طالبہ کا میٹرک پاس ہونا لازمی تھا چونکہ مجھے اللہ تعالیٰ نے دادا جان کے ساتھ مل کر مدرسہ تعلیم الاسلام میں کام کرنے کا موقع عطا فرمایا تھا اس لیے جب رابطہ کی شرائط کے تحت ہم نے میٹرک سے کم طالبات کو داخلہ نہ دیا اور کچھ طالبات جو داخلے کی نیت سے آئی تھیں واپس جانے لگیں تو دادا جان بہت افسردہ ہوئے کہنے لگے کیا ہم ان بچیوں کو قرآن و حدیث اس لیے نہ پڑھائیں کہ وہ میٹرک پاس نہیں ہیں؟ جس معاشرے میں قرآن نازل ہوا تھا کیا وہ صرف میٹرک پاس لوگوں کے لیے تھا؟ ان طالبات کو ہرگز واپس نہ بھیجا جائے۔ چنانچہ ایسی طالبات کیلئے ایک لگ شعبہ بنا کر ان کے لیے آسان نصاب بنایا گیا اور ایسی طالبات کو قرآن و حدیث کی تعلیم کے ساتھ ساتھ میٹرک کی تیاری بھی کرائی جانے لگی۔ کہنے لگے یہاں جو بچی بھی قرآن سیکھنے آئے اسے اس سے محروم نہ رکھا جائے۔ اس موقع پر مجھے سورۃ عبس وتولیٰ پڑھ کر سنائی اور اس کا ایک ایک لفظ تشریح کر کے سمجھایا۔ وہ تو ایک دریا تھا، ہر ایک کو سیراب کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار آنے والوں کا ظرف کہ وہ کیا لے کر جائیں ہمیشہ وضو میں رہنے والے میرے دادا جان کے کپڑوں سے ایک خاص خوشبو آتی تھی اور ان کے ہاتھ پاؤں ہر وقت چمکتے رہتے تھے۔

مطالعہ کا بہت شوق تھا ان کے کمرے میں ان کی چارپائی کی اردگرد کتابیں ترتیب سے رکھی ہوتیں۔ کتب حدیث کا مطالعہ اس طرح ڈوب کر کرتے کہ کبھی کبھی ہم بچوں کو انہیں جا کر بتانا پڑتا کہ کھانا تیار ہے یا رات ہو چکی ہے۔ حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے مگر بہت زیادہ وقت اخبار پڑھنے میں نہیں گزارتے تھے۔ بلکہ وقت کی قدر کوئی ان سے سیکھتا۔ کھانا شروع کرتے تو مجھے کہتے کہ اپنی کتاب لے آؤ۔ میں نے ان سے قصص النبین اور معلم الانشاء رات کے کھانے کے دوان ہی پڑھی۔ رمضان میں جب افطاری کے بعد کھانا کھا رہے ہوتے تو کہتے کہ جو پارہ آج رات تراویح میں میں نے سنانا ہے وہ تم مجھے سناؤ تا کہ میری دہرائی ہو جائے۔

سنتوں پر عمل کا بہت اہتمام تھا۔ خصوصاً صبح و شام کے اذکار دعائیں اذان کے الفاظ اور دعا بلند آواز میں پڑھتے تھے۔ میرے شعور میں جو پہلے الفاظ محفوظ ہیں وہ ہیں سبحان الملک القدوس، یہ الفاظ تہجد کے بعد بلند آواز میں پڑھتے تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے روزانہ کی دعائیں کسی کتاب سے سبقاً سبقاً یا دکی ہوں انہی سے سنا تو یاد ہو گئیں۔

میرے علاوہ اور بہت سے لوگ اس بات کی گواہی دیں گے کہ دنیا کی محبت سے ان کا دل خالی تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اللہ

کے دین کی اشاعت کے ذریعے اپنی آخرت سنوارنے کیلئے وقف کر رکھی تھی۔ شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو ان کے پیچھے لگا دیا۔ اکثر یہ حدیث سنایا کرتے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اے ابن آدم تو اپنے آپ کو میرے لیے مصروف کر لے میں تیرے سینے کو تونگری سے بھر دوں گا اور تیری ضرورتیں پوری کروں گا اور اگر تو ایسا نہ کرے تو تیری ضروریات کو بڑھا دوں گا اور انہیں کبھی پورا نہ کروں گا۔ ہمیشہ سادہ غذا اور سادہ لباس استعمال کیا۔

محبت تو انہیں ساری اولاد سے تھی مگر چونکہ ہم ہمیشہ ان کے ساتھ رہے اس لیے شاید میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ہم بہن بھائیوں نے اپنے دادا دادی کی محبت خوب خوب وصول کی۔ ہمارا بچپن تو ان دونوں ہستیوں کی محبتوں سے سرشار ہے۔ میری امی مرحومہ سے انہیں بہت محبت تھی۔ امی نے اپنی بے لوث خدمت سے ان کے دل میں وہ مقام حاصل کر لیا تھا جو کسی اور کے نصیب میں نہیں تھا۔ میری امی ان کے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ خصوصاً سر پر تیل سے مالش کرانا تو دادا جان کو کسی اور سے پسند ہی نہ تھا۔ مسکراتے ہوئے کہتے۔ ''صفیہ مجھے تمہاری مصروفیت کا اندازہ ہے مگر میرا سر تیل مانگ رہا ہے۔'' میری امی سب کام کاج چھوڑ کر فوراً اٹھ جاتیں اور ان کی مالش کرنے لگتیں۔ جس صبح میری امی کا انتقال ہوا، آدھا گھنٹہ پہلے دادا جان کو لسی بنا کر پلائی، وضو کرایا، اپنے دوپٹے کے پلو سے ان کے پاؤں خشک کر کے انہیں جوتا پہنایا، انہیں اور میرے ابا جی کو مسجد بھیج کر خود اللہ کے حضور پہنچ گئیں۔ گویا اپنی مصروف زندگی کا آخری کام بھی اس عظیم ہستی کی خدمت کرنا تھا۔ میری امی کی وفات پر دادی جان ان الفاظ میں گواہی دے رہی تھیں۔ ''میری صفیہ تیرے لیے تو گلیوں کے تنکے بھی گواہ ہیں کہ آج تک تم نے کسی کا دل نہیں دکھایا، آج تو اپنے بوڑھے والدین اور اولاد کو دکھی کر کے کیوں چلی گئی۔'' جب اچانک امی جان کی وفات نے سارے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا تو سب کو حوصلہ دلانے والے بھی دادا جان ہی تھے۔ بار بار انا للہ وانا الیہ راجعون.....

پڑھتے جاتے اور صبر کی تلقین کرتے جاتے۔ میرے بہن بھائیوں سے محبت اور بھی بڑھ گئی۔ امی اور پھر 9 ماہ بعد دادی امی کی وفات کے بعد وہ میرے ابا جی کے لیے بہت بڑا سہارا بن گئے۔

ان کی صحت زندگی بھر قابل رشک رہی، نہ شوگر نہ بلڈ پریشر، البتہ زندگی کے آخری چند سالوں میں جسم پر خارش کی تکلیف ہوگئی مگر صبر مثالی تھا۔ ایک مرتبہ میں نے کہا کہ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے سیدنا ایوب جیسی بیماری میں مبتلا کیا ہے۔ آپ یہ دعا پڑھا کریں۔

انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین

سن کر بہت خوش ہوئے دعا دی اور کہا کہ اچھا کیا تم نے مجھے یاد دلایا۔ 2003ء میں اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی تو میں ملنے چلی گئی دو تین دن میں طبیعت سنبھل گئی۔ ایک دن میں ان کے پاس بیٹھی تھی ایک سوال جو عرصے سے میرے ذہن میں تھا موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے پوچھا۔ دادا جان آپ نے ساری زندگی اللہ کے راستے میں جدوجہد میں گزاری ہے آپ کا کوئی ایسا عمل جسے اللہ کی بارگاہ میں پیش کر سکیں۔ عموماً لوگ تہجد کو ایک بڑا عمل جانتے ہیں اور ہوش سنبھالتے ہی میں نے ان کو تہجد کی پابندی کرتے دیکھا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ شاید یہی ان کا جواب ہوگا۔ وہ میری بات سن کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے پھر مسکرائے اور کہنے لگے تمہیں اس کا خیال کیسے آیا۔ اچھا تمہیں بتاتا ہوں..... میں جب اپنے نامہ اعمال کو دیکھتا ہوں تو مجھے کوئی بھی عمل ایسا نظر نہیں آتا جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیے جانے کے قابل ہو، میں تو اللہ سے اس کے فضل و رحمت کا سوالی ہوں۔ البتہ ایک چیز جو مجھے کچھ اطمینان دلاتی ہے وہ یہ کہ آج میرے اطراف تعلیم کے جو پھول کھلے ہوئے ہیں، اسی درخت کا بیج بونے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے مجھے بخشی تھی اتنا جواب دیا اور خاموش ہوگئے۔

الحمدللہ آج دادا جان کے قائم کردہ مدرسہ کے مکمل انتظام کی ذمہ داری میرے والد صاحب نبھا رہے ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ اور میرے چھوٹے چچا جان عبدالشکور

ایک شاندار تعلیمی ادارہ قائم کرنے کے علاوہ پاکستان کے غریب و نادار مگر ذہین بچوں کے لیے الفلاح سکالرشپ سکیم کے بانی ہیں اور اس وقت ایک ہزار سے زیادہ طلبہ وطالبات الفلاح کے وظائف سے ملک کے مختلف تعلیمی اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان ساری کوششوں کو دادا جان کیلئے صدقہ جاریہ بنائے۔

زندگی کے آخری ایام میں کمزوری بہت غالب تھی۔ وہ بہت خوش قسمت تھے کہ ان کی ساری اولاد نے ان کی خوب خدمت کی۔ ان کے بیٹے اور پوتے جب ان کو اٹھا کر بٹھاتے تو ساتھ یہ دعا بھی پڑھتے۔ رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا.....تو پاس بیٹھنے والوں کو ان پر بڑا رشک آتا۔

شادی کے بعد میں انگلینڈ جانے لگی تو اپنے پاس بٹھایا، بہت ساری نصیحتیں کیں آخر میں کہنے لگے۔ اگر تمہیں وہاں پر میری موت کی خبر ملی تو پاکستان آنے کی جلدی نہ کرنا وہیں سے میرے لیے دعائے مغفرت کرتی رہنا۔ البتہ مجھے اپنے اللہ سے پوری امید ہے کہ وہ میری تم سے ملاقات کرائے گا۔

مئی 2007ء میں ان کی طبیعت بہت کمزور ہوگئی تو میں اپنے ابا جی کے کہنے پر بچوں کو چھوڑ کر ایک ہفتے کے لیے ان سے ملنے چلی گئی۔ ملاقات پر بہت خوش ہوئے دعائیں دیں۔ جب میں واپس آنے لگی تو بار بار دل میں یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ دیا تو اب بجھنے کے قریب ہے اب تو یہ میری آخری ہی ملاقات ہوگی۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کی دعائیں قبول ہو چکی ہیں اسی سال اگست میں میرے شوہر کو جدہ میں جاب مل گئی اور میں ستمبر میں بچوں کے ہمراہ جدہ آ گئی۔ یہاں سے فون پر بات ہوئی تو بہت خوش ہوئے، کہنے لگے کہ اگر میری صحت بہتر ہوگئی تو میں تمہارے پاس آؤں گا پھر عمرہ بھی ادا کروں گا۔

نومبر کے پہلے ہفتے میں میرے چھوٹے بھائی کی شادی طے پائی، خدا جانے کیسے اقامہ وغیرہ کا کام چند دنوں میں مکمل ہو گیا اور میں یکم نومبر کو پاکستان چلی گئی۔ دادا جان سے ملاقات ہوئی تو بہت خوش ہوئے ایک ایک بچے کو قریب بلایا سر پر ہاتھ پھیرا دعا دی کہنے لگے اسماعیل (میرا بڑا بیٹا) سے کہنا مجھے قرآن سنائے۔ ہم سب بہن بھائی جمع ہو چکے تھے۔ سب بچوں کو اپنے گرد دیکھ کر ان کی خوشی دیدنی تھی 3 نومبر کو میرے بھائی کو بارات کے لیے رخصت کیا ساتھ یہ بھی کہا کہ میری طبیعت کمزور ہے جلدی واپس آنا۔ بارات تو جلدی واپس آ گئی مگر دادا جان اپنے پوتے پوتیوں کو اپنے پاس جمع دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر چکے تھے کہ پھر کمزوری بڑھتی گئی۔ رات کو کچھ بے چینی تھی مگر منگل کی صبح وہ بہت پرسکون تھے۔ میں ان کی چارپائی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میرا ایک ہاتھ ان کے ماتھے اور ایک سینے پر تھا۔ کچھ دیر ہلکی سانسیں لیتے رہے پھر چپکے سے جان جان آفریں کے سپرد کر دیں۔ زندگی بھر ذکر الٰہی میں مشغول رہنے والے انسان کے آخری ایام بھی ذکر سے معمور تھے۔ دوسری دعاؤں کے علاوہ حسبی اللہ لا الہ الا ھو..... والی آیت ہر وقت ان کی زبان پر رہتی۔ زندگی میں بھی وہ یہی کہا کرتے تھے کہ آؤ مجھے قرآن سناؤ۔ وفات کے بعد ان کی پوتیاں باری باری انہیں قرآن سنا رہی تھیں۔ تلاوت کی ان آوازوں میں ان کی طالبات کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

مغرب کے بعد جنازہ اٹھا، تھوڑی دیر کے لیے میت کو مدرسہ لے جایا گیا۔ جہاں طالبات نے ان کی آخری زیارت کی اور مغفرت کی دعاؤں کے ساتھ انہیں رخصت کر دیا گیا زندگی بھر ان کا یہ معمول رہا کہ وہ عصر کے بعد قبرستان جا کر اہل قبور کی مغفرت کی دعا کرتے تھے۔ ان کے جنازے پر کسی کہنے والے نے یوں کہا کہ آج مولانا کی کمی زندہ لوگوں کیلئے ہی نہیں، قبروں والے بھی ان کی دعاؤں سے محروم ہوگئے.....یقیناً فرشتوں نے کہا ہوگا.....

''اے نفس مطمئنہ چل اپنے رب کی طرف۔ راضیہ ومرضیہ..... داخل ہو جا اس کے بندوں میں اور داخل ہو جا اس کی جنتوں میں۔''

اک ہاتھ جو رہتا تھا دعا کی طرح سر پر
اک سایہ گھنیرا تھا جو اب اٹھ گیا سر سے

اے اللہ جیسی محنتیں اس بندے نے تیرے دین کے لیے کیں تو انہیں ان کا بہترین صلہ عطا فرمانا اور ان کو جنت الفردوس کے بالاخانوں میں اپنی رضا کے ساتھ داخل فرما دینا.....آمین۔

☆☆☆☆

کتاب ذریعہ انقلاب

سوویں ایڈیشن کے موقع پر ''خطبات'' کے بارے میں چند تاثرات

(۱)

کتاب کی اہمیت کیا ہے اور یہ انسان کی زندگی میں کیسے انقلاب برپا کر دیتی ہے۔اس کے بہت سے واقعات خود اپنی آنکھوں سے دیکھے بھی تھے اور کئی لوگوں کے ذاتی تجربات کی رودادیں پڑھی اور سنی بھی تھیں۔لیکن مولانا غلام محمد منصوری صاحب نے ایک واقعہ بیان کیا جو بلاشبہ بہت دلچسپ بھی ہے اور ایمان افروز بھی.....

انہوں نے فرمایا کہ منصورہ (سندھ) میں جماعت کے ایک رکن تھے جن کا نام حکیم عبدالقادر تھا۔موصوف شہداد کوٹ کے رہنے والے تھے۔ایسے اللہ والے کہ ان کو دیکھ کر حدیث رسولؐ کے مطابق اللہ کی یاد سے دل معمور ہو جاتے۔شروع میں آوارہ قسم کے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔جن لوگوں کے ساتھ ان کی یہ نشست و برخاست تھی وہ جرائم کی دنیا کے بادشاہ تھے۔انہوں نے کسی شخص کے قتل کا منصوبہ بنایا۔عبدالقادر صاحب بھی اس مشورے اور منصوبے میں شریک تھے۔طے یہ پایا کہ عبدالقادر صاحب سیڑھی لے کر آئیں گے اور دوسرا شخص کوئی اسلحہ لے کر آئیگا پھر اس طرح سیڑھی کے ذریعے چھت پر چڑھیں گے اور اس نامزد شخص کو رات کو قتل کر دیں گے۔ظاہر ہے یہ کام رات کے پچھلے حصے میں کیا جانا تھا۔

عبدالقادر صاحب کو حسن اتفاق سے اس رات اس انتظار میں کہ وقت گزرے اور وہ سیڑھی لے کر جائیں، نیند سے نجات حاصل کرنے کے کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوئی اس تلاش میں ان کے ہاتھ ایک کتاب لگی اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔کتاب پڑھتے چلے گئے تآنکہ رات بیت گئی ان کا ساتھی انتظار کرتا رہا مگر یہ پلٹ کر نہ آئے اگلے روز اس نے ان کو بہت گالیاں دیں اور کہا کہ تم نے سارا منصوبہ ناکام بنا دیا۔اس کی گالیاں سن کر جواب میں انہوں نے بتایا ''میرے دل کی دنیا بدل چکی ہے، اب میں وہ انسان نہیں جو کل تھا آج میری زندگی بدل چکی ہے اب میں ایسے کاموں میں ہرگز حصہ نہیں لے سکتا۔''

یہ کتاب سیدا بوالاعلیٰ مودودی کی ''خطبات'' تھی جو حکیم صاحب کے لیے اللہ نے مقدر کر دی تھی۔انہوں نے پڑھی اور اس کے بعد ان کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا۔

(اقتباس: نگری نگری پھرا مسافر، صفحہ نمبر 208، 209 حافظ محمد ادریس)

(انتخاب: اُمِ جویریہ)

(۲)

پاکستان میں نئی زندگی کے ابتدائی 30 سال گزرنے کے بعد جب میں روزگار کی تلاش میں متحدہ عرب امارات پہنچا تو بہت سے اور خوشگوار انکشافات کے علاوہ ایک نئی چیز جس سے میں آشناء ہوا وہ تھی مولانا مودودی کی کتاب خطبات۔اپنے بچوں کیلئے میں نے ایک اسلامی سکول کا انتخاب کیا۔سکول کے مالکان ایک ہندوستان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹری پیشے کے میاں بیوی تھے۔ڈاکٹر رقیہ اور ڈاکٹر جعفر صدیقی، سکول میں بھرتی ہونے والے ہر ٹیچر سے یہ مطالبہ تھا کہ وہ انٹرویو کے لیے ''خطبات'' اور ''دینیات'' دو کتابیں لے جائے اور ان کا خوب گہرائی سے مطالعہ کرے۔انٹرویو کے سارے سوالات انہی دونوں کتابوں میں سے ہوں گے جب میرے علم میں یہ بات آئی تو مجھے بھی شوق ہوا کہ میں ان کتابوں کو حاصل کروں اور دیکھوں کہ ان میں کیا ہے۔

لہٰذا میں نے پہلی دفعہ خطبات کا مطالعہ کیا اور میں حیرت کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔مجھے پہلی دفعہ مولانا مودودی کے بارے میں پتہ چلا اور مجھے دکھ ہوا کہ پاکستان میں مجھے کیوں نہ کسی نے ان کے بارے

میں بتایا۔ کتاب کے انداز سے واضح ہوا کہ مولانا کو بنی نوع انسان کے ساتھ بہت زیادہ ہمدردی تھی۔ اور جیسے ایک باپ یا ایک شفیق اور مہربان استاد اپنے بچوں کو سمجھاتا ہے اسی طرح انہوں نے دین کی بنیادی باتوں کو لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور نہایت ہی سادہ زبان میں..... کوئی مشکل لفظ نہیں استعمال ہوا، کوئی فارسی کے مشکل اشعار نہیں لکھے گئے، کوئی عبارت آفرینی اور قافیہ پیمائی نہیں۔ پوری کتاب میں مثالوں کے ذریعے بات کو واضح کرنے کا انداز بہت خوب ہے۔ مجھے پہلی دفعہ کلمہ طیبہ کے معنی صحیح طور پر سمجھ آئے کہ اللہ بندے سے کیا مطالبہ کرتا ہے۔ اگر ہمارا نوکر ہمیں بار بار سلام کرتا رہے۔ محبت کے دعوے کرتا رہے مگر حکم کوئی نہ مانے تو کیا فائدہ۔ اسی طرح ایک مریض صرف دوائی کے نام کا ورد کرتا رہے مگر کھائے نہ تو بیماری پہ کوئی فرق نہ پڑے گا۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہوا تھا کہ کس طرح لوگ کلمہ طیبہ کا اور آیت کریمہ کا لاکھوں دفعہ ورد کرتے ہیں مگر اس کا ان کی زندگیوں میں کوئی اثر نظر نہیں آتا۔

اسی طرح سے مجھے مسلم اور کافر کا فرق پہلی دفعہ سمجھ میں آیا کہ اصل چیز اسلام اور کفر کا فرق ہے، علم اور عمل کا فرق ہے اور یہ کہ آج کا مسلمان ذلیل ہی اس لیے ہے کہ اس کا عمل نہیں رہا۔

پھر خطبات کے بارے میں انہی دنوں میں نے ایک اور بات سنی کہ مولانا یوسف اصلاحی صاحب (انڈیا) نے اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی کو خطبات کتاب بطور تحفہ دی اور اسے کہا کہ اس کے کچھ صفحات وہ ان کے سامنے پڑھے تاکہ روز قیامت وہ اللہ کے سامنے گواہ رہے کہ انہوں نے حق بات اس تک پہنچائی ہے۔ ان کے اصرار پر اندرا گاندھی نے اسی محفل میں اس کے چند صفحات پڑھے۔ مجھے شدید افسوس تھا کہ پاکستان میں یہ کتاب اس وقت (کم از کم میرے حلقہ احباب میں) اتنی مشہور نہ تھی اور پاکستانی لوگوں میں اس کا چرچا اتنا نہ تھا جتنا ہندوستانی مسلمان لوگوں میں۔ ہندوستان کے ایک بٹکلی خاندان کے کچھ افراد نے تو باقاعدہ یہاں کی اوقاف سے اجازت لے کر مولانا مودودی کی تمام تصانیف کی بہت ہی اچھی لائبریری بنا رکھی تھی ڈیرہ کے علاقے میں۔ وہاں بھی مجھے چند بار جانے کا اتفاق ہوا۔

خطبات نہایت ہی عام الفاظ میں عام لوگوں سے مخاطب ہے۔ حوالہ جات وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ کسی کند ذہن بندے کو بھی یہ باتیں سمجھ میں آسکتی ہیں۔

مولانا مودودی کی یہ صلاحیت بہت ہی اہم ہے۔ انہوں نے خطبات میں بات کو ایسے واضح کیا ہے کہ سادگی اور اثر انگیزی کے اس امتزاج کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ جب وہ ایوب خان سے ملے تو اس نے بھی اس بات کا اعتراف کیا کہ مولانا جیسے بات سمجھا سکتے ہیں ویسے کوئی نہیں سمجھا سکتا۔

خطبات پڑھنے کے بعد مجھے کچھ اور باتوں کا جو اندازہ ہوا وہ تھیں ''سوچنے کی باتیں..... قرآن کے ساتھ ہمارا سلوک..... اللہ کی کتاب پر ظلم کا نتیجہ..... اس کے بعد ہی میں نے قرآن کو ترجمہ کے ساتھ اور عربی گرائمر کے قواعد پڑھنا شروع کیے۔ والحمداللہ علی ذلک

اللہ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے زیادہ سے زیادہ افراد کو فیض یاب ہونے کا موقع ملے اور ہمیں پورے مکمل دین اسلام پر عمل کرنے کی توفیق عطا ہو (آمین)

(رشید احمد..... شارجہ)

(۳)

خطبات کو میں نے بارہا پڑھا ہے اور زندگی کے ہر مرحلے پہ نئی سمجھ آئی ہے۔ خصوصاً اس کا یہ اقتباس مجھے ہمیشہ بہت اچھا لگتا ہے اور میں اس سے بہت (Motivation) جذبہ حاصل کرتی ہوں۔ کالج کے زمانے میں میں نے اپنی ڈائری کے پہلے صفحے پہ اسے لکھا ہوا تھا۔

''قرآن تو خیر کا سرچشمہ ہے۔ جتنی اور جیسی خیر تم اس سے مانگو گے یہ تمہیں دے گا۔ تم اس سے محض جن بھوت بھگانا اور کھانسی بخار کا علاج اور مقدمہ کی کامیابی اور نوکری کا حصول اور ایسی ہی چھوٹی ذلیل اور بے حقیقت چیزیں مانگتے ہو تو یہی تمہیں ملیں گی۔ اگر دنیا کی بادشاہی اور روئے زمین کی حکومت مانگو گے تو وہ بھی ملے گی اور اگر عرش الٰہی کے قریب پہنچنا چاہو گے تو یہ تمہیں وہاں بھی پہنچا دے گا۔ یہ

تمہارے اپنے ظرف کی بات ہے کہ سمندر سے پانی کی دو بوندیں مانگتے ہو ورنہ سمندر تو دریا بخشنے کیلئے بھی تیار ہے۔''

(ڈاکٹر فرح کوثر فاروق.....شارجہ)

(۴)

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان کہ اس نے مجھے مسلمان گھرانے میں پیدا کیا اور نیک والدین کی گود میں پرورش کی نعمت عطا کی جس کی وجہ سے جوانی تک پہنچتے ہوئے یہ احساس اور شعور شخصیت کا حصہ بن گیا کہ میں ایک باعمل مسلمان ہوں۔لیکن جب مولانا مودودیؒ کی کتاب ''خطبات'' ایک مخلص بہن کے ہاتھوں ملی اور اسے پڑھا تو دل و دماغ کو نئی روشنی عطا ہوئی۔مولانا لکھتے ہیں۔

''اسلام کے معنی خدا کے مقابلے میں اپنی آزادی و خودمختاری سے دست بردار ہو جانا ہے۔خدا کی بادشاہی و فرماں روائی کے آگے سر تسلیم خم کر دینا اسلام ہے۔اور مسلمان وہ ہے جو ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ سے پوچھتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے اور جو ہدایت وہاں سے ملے اس کو بے چون و چرا مان لیتا ہے اور اس کے خلاف ہر چیز کو رد کر دیتا ہے۔وہ اور صرف وہی ''مسلمان'' ہے۔''

مولانا کا دلنشین، مدلل اور جامع انداز میں اسلام کو پیش کرنا میرے دل و دماغ سے دل میں ایک ایسا محاسب بٹھا دیتی ہے جو دو بین لگائے ہر آنے جانے والے خیال کو پہلے پرکھتا ہے جانچتا ہے کہ کیا یہ مفید ہے یا نقصان دہ اور اگر اس پر جھٹ پٹ دل نے عمل کرنے کی خواہش کی تو پھر یقین جانئے مولانا کی یہ کتاب محاسب ہی نہیں رہتی بلکہ ایک سرجن کا وہ تیز دھاری آلہ بن جاتی ہے جو دل و دماغ پر چڑھی بڑی سے بڑی خود فریبیوں، خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں کی جھلیوں کو صاف کر کے تشکیک و ریب کو ایمان و یقین میں بدل ڈالتی ہے۔

دوسری بات جو خطبات پڑھتے وقت دل میں گھر کر جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا مودودی نے اسلام کے بنیادی ارکان کو دل میں اتر جانے والے دلائل کے ساتھ آسان انداز میں پیش کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ معیاری زبان اور ادبیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔عام فہم مثالوں کے ذریعے سے ان سادہ دل دیہاتیوں کو بنیادی عقائد کی ایسی تقلید دی کہ پڑھا لکھا شخص تو معترف و مداح ہوا سو ہوا سیدھے سادے کم تعلیم یافتہ لوگوں کے سینوں کو بھی نور ایمان سے منور کر دیا۔ان میں کتنے ہی دہریت و الحاد کے علم بردار اسلام کے نقیب بن گئے۔مثلاً خطبات میں مولانا مودودی کلمہ طیبہ کے معنی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔کہ

''میرے بھائیو! تم ذرا سمجھ سے کام لو گے تو تمہاری عقل خود کہہ دے گی کہ فقط منہ کھول کر زبان ہلا کر چند حرف بول دینے کی اتنی بڑی تاثیر نہیں ہو سکتی کہ جو غیروں کو ایک دوسرے سے ملا دیتی ہے اور اپنوں کو ایک دوسرے سے کاٹ دیتی ہے۔حتیٰ کہ اس کلمے کا زور اتنا ہے کہ خون اور رحم کے رشتے بھی اس کے مقابلے میں کچھ نہیں۔الفاظ کی تاثیر معنوں میں ہے.....''

(طاہرہ امین.....سویڈن)

(۵)

''خطبات'' جو مولانا مودودی کے خطبوں کا مجموعہ ہے، ایک بہت ہی عمدہ کتاب ہے۔آسان زبان کی بدولت کم پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔اس کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اپنے کسی عزیز دوست یا مخلص ہمدرد سے بات کر رہے ہیں۔جو ہمیں دین کو سمجھانے اور اس پر عمل کرنے کے آسان طریقے بتا رہا ہے۔ہمارے نزدیک اسلام کے ارکان کو مان لینا اور نماز روزہ کی ادائیگی ہی مسلمان ہونا ہے۔خطبات سے پتہ چلا کہ مسلمان کی ساری زندگی عبادت ہے اور زندگی کے کسی گوشے کو اسلام سے خارج کر کے پورا مسلم نہیں بنا جا سکتا۔اور شیطانی قوتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا ہی مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے۔نماز، روزہ، حج، تسبیحات تو دراصل اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی یاددہانی کے لیے فرض کیے گئے ہیں۔

مولانا نے ریاست کے قیام کے لیے اتحاد کی اہمیت پر زور دیا ہے۔یعنی اجتماعیت کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔اور مسلمان کو پوری دنیا میں اللہ کا قانون نافذ کرنے کی جدوجہد کی دعوت دیتے ہیں۔

(عزہ اشتیاق.....شارجہ)

☆☆☆☆

تبصرہ کتب

نام کتاب: پیغام قرآن وحدیث
مؤلف: یوسف ثانی
ویب سائٹ: www.paighamequran.com
ملنے کا پتہ: پیغام قرآن پبلی کیشن پوسٹ بکس 12207 ڈیفنس اتھارٹی کراچی۔

یہ کتاب جناب یوسف ثانی کی مسلسل کاوشوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے مکمل دین کو یکجا کر کے ہر ایک کے لیے اٹھتے، بیٹھے، سفر میں، تنہائی میں، وضو بے وضو، اس سے استفادہ حاصل کرنا آسان کر دیا ہے۔ خصوصاً یہ ریسرچ کا کام کرنے والوں کیلئے بہت فائدہ مند ہے۔ قرآن سے استفادہ کرتے ہوئے کسی حدیث کے حوالے کی ضرورت پڑی تو دوسری کتاب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پیغام قرآن کی دوسری طرف مکمل صحیح بخاری شریف کی احادیث آسان اردو میں موجود ہیں۔

پیغام قرآن کو مزید آسان بنانے کیلئے جہاں کہیں بھی امر و نہی کے احکامات موجود ہیں انہیں جلی حروف میں نمایاں کیا گیا ہے اور خط کشیدہ الفاظ سے واضح کر دیا گیا ہے تاکہ قارئین ایک ہی نظر میں امر و نواہی سے واقف ہو جائیں۔ قرآن کریم اور احادیث کے آخر میں احکامات کا اشاریہ (Index) بھی دیا گیا ہے جو اہم مضامین کی تلاش میں بہت مددگار ہے۔

اس کتاب کے جملہ حقوق قارئین کے نام محفوظ کر دیئے گئے ہیں، ہر کوئی اس سے استفادہ کر سکتا ہے اور ثواب کی غرض سے چھپوا کر تقسیم کر سکتا ہے۔

اردو نثر کی روانی اور سلاست نے کتاب کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے۔ صحیح بخاری کو سمجھنا اتنا سہل کر دیا کہ عام قاری جب احادیث مبارکہ پڑھنی شروع کرتا ہے تو پھر کتاب رکھی نہیں جاتی۔ یہ کتاب مصنف کے حق میں زبردست صدقہ جاریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششیں قبول فرمائے۔

(غزالہ ارشد)

☆.....☆.....☆.....☆

نام کتاب: تعمیر پاکستان: مذہبی، ثقافتی محرکات.....کل اور آج
مصنف: ڈاکٹر محمد آفتاب خان
صفحات: 350..... قیمت: 300 روپے
ناشر: لاہور ادبیات، رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

پاکستان کی تاریخ و تعمیر اور استحکام و فلاح کے موضوعات پر ہمارے ہاں تحریر کردہ کتب کی کمی نہیں۔ اس کے باوجود ہماری زیر تبصرہ کتاب ایک ممتاز نگارش ہے۔ مصنف وٹنری یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور اسی شعبہ میں انہوں نے ڈاکٹریٹ کیا ہے۔

''آغازِ سخن'' کے عنوان سے محترم مصنف اس کتاب کو تحریر کرنے کا پس منظر بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول.....تحریک پاکستان کا پس منظر، تقسیم ہند اور پاکستان کا پیش منظر۔

دوسرا حصہ: تین مشاہیر عظام، اقبال، قائداعظم اور سید مودودی کے باہمی تعلق کو یوں واضح کرنا کہ.....

☆.....اقبال نے تصور پاکستان دیا۔
☆.....قائد نے تشکیل پاکستان کی.....اور
☆.....سید مودودی نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کیلئے

خدمات انجام دیں۔

دیباچہ پروفیسر ڈاکٹر محمد وسیم اکبر شیخ صاحب کا تحریر کردہ ہے جو گومل یونیورسٹی کے شعبہ جرنلزم کے چیئرمین ہیں۔ انہوں نے مصنف کی حب الوطنی، دردمندی اور تحقیقی عرق ریزی و دیدہ ریزی کی تعریف وتحسین کرنے کے بعد لکھا ہے۔

''علامہ محمد اقبال، قائداعظم محمد علی جناح اور سید ابوالاعلی مودودی تین ایسی عظیم شخصیات ہیں جن کے افکار ونظریات میں کافی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ تینوں انگریزوں اور ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں سے آگاہ تھے۔ اور انہوں نے اپنی تقاریر و تصانیف کے ذریعے مسلمان قوم کو ان سازشوں اور فتنوں سے آگاہ کیا جو مسلمانوں کیلئے نقصان دہ تھے۔ مغربی جمہوریت قومیت پرستی، لادینیت، جدید تعلیم، آزادیٔ نسواں.....اور مسلمانوں پر مغربی تہذیب وثقافت کی یلغار ایسے عنوانات ہیں جن پر ان اصحاب کے خیالات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔''

کتاب سترہ ابواب پر مشتمل ہے۔ چار ضمیمہ جات اس کے علاوہ ہیں جو باب نہایت مدلل حوالہ جات سے مزین اور ڈنکے کی چوٹ حقائق اور سچائی کا نقیب ہے۔ صرف ایک باب بعنوان مغربی تعلیم اور تہذیب کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے ذیلی عنوانات کے ذریعے

☆.....علامہ اقبال کے افکار.....مغربی طرز تعلیم، مذہبی تعلیم

☆.....اقبال کا مطلوبہ نظام تعلیم.....قائداعظم محمد علی جناح کے فرمودات

☆.....سید ابوالاعلی مودودی کے تعلیمی افکار.....علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لئے تعلیمی نظام کا خاکہ، مسلمان طلباء کو نصیحت

مذہبی مدرس کی تعلیم کا جائزہ، ایک نیا نظام تعلیم، عورتوں کی تعلیم اسی طرح ایک اور باب تصور وطنیت پڑھنے کے بلکہ یاد رکھنے کے لائق ہے جس میں قابل قدر مصنف نے ''مولانا مودودی کے خلاف پراپیگنڈہ کی حقیقت'' ''مودودی کا استدلال'' اور اسی طرح کے دوسرے ذیلی عنوانات کے تحت مستند حوالہ جات کے ساتھ مخالفین مودودی کا تعاقب اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ چند اقتباسات نقل کرنے کو دل تو چاہتا ہے مگر کالم کا دامن اس کی اجازت نہیں دے رہا۔

10 انگریزی کتب اور 66 اردو کتب کی کتابیات تعمیر پاکستان کو حُسن اور حُسن عطا کر رہی ہے اور قدر و قیمت میں اضافہ بھی۔

جابجا برمحل اشعار کا استعمال ڈاکٹر آفتاب صاحب کے ادبی ذوق کا غماز ہے ادارہ ادبیات نے خوبصورت اور آفریں سرورق اور مضبوط جلد کے ساتھ یہ کتاب شائع کر کے اپنے علم دوست ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

(فرزانہ چیمہ)

☆.....☆.....☆.....☆

نام کتاب: آس نے دل کا ساتھ نہ چھوڑا

مصنفہ: قانتہ رابعہ

صفحات: 224..... قیمت 180 روپے

ناشر: لاہور، ادبیات، رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار

اردو ادب میں رئیس امروہوی اور ایم اسلم زود نویسی کے لئے کافی مشہور ہوگزرے ہیں وہ ہفتے دس دن میں ایک ناول لکھ لیا کرتے تھے۔ عہد حاضر میں خواتین میں زود نویسی کیلئے قانتہ رابعہ کا نام بڑی آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ جو محض گھنٹے، دو گھنٹے بلکہ بعض اوقات منٹوں میں کہانی، افسانہ تخلیق کر لیتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ان کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے اس سے پہلے راہ وفا، بہار آنے کو ہے، دل نے جب مان لیا، کے عنوانات سے ان کے متنوع اور رنگا رنگ افسانے اشاعت پذیر ہو کر قارئین سے داد وصول کر چکے ہیں۔ انسانی شخصیت پر نام کا کافی اثر پڑتا ہے چنانچہ کیسے ہوسکتا ہے کہ قانتہ کا قلم بے مقصد، بے سمت اور بے معنی ادب تخلیق کرتا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا افسانہ ہو، کالم ہو یا روداد و رپورتاژ وغیرہ ہر کہیں مثبت سوچ کو الفاظ کے روپ میں ڈھالا ہے۔

آس نے دل کا ساتھ نہ چھوڑا..... اس کتاب کا سب سے طویل اور ہمارے نزدیک سب سے بہترین افسانہ ہے۔ کہانی کہتے کہتے خوبصورت جملے جو زندگی کا رخ موڑ دیں..... قانتہ بڑی آسانی سے لکھتی چلی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر۔

''زندگی مرد کے ساتھ اچھی گزرنی چاہیے..... رشتہ داروں کی خامیاں زکوٰۃ سمجھ کر برداشت کر لینی چاہئیں.....'' (مان لیا دل نے میرا فیصلہ)

''اپنے مجازی خدا کی خوشنودی کے حصول کیلئے اتنی پلاننگ میں سے کچھ حصہ حقیقی خدا کی خوشنودی کیلئے بھی رکھنا چاہیے تھا۔'' (بات لمحے بھر کی تھی)

''دوست تو ہم آہنگ ہوتے ہیں ہم پیالہ و ہم نوالہ..... کڑوے کسیلے، میٹھے کھٹے، روکھے پھیکے سب ذائقے تو رشتہ داروں سے چکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ رشتہ دار تو گیلی سلگتی لکڑیاں ہیں، جلیں تو تپش، نہ جلیں تو دھواں.....(عید ہے ملنے کا نام)

قانتہ رابعہ کے افسانے ایسے ہیں کہ والدین خود خرید کر اپنے بچوں کے ہاتھوں میں دیتے ہیں کہ یہ کردار کو نکھارنے والے، حسن عمل پہ ابھارنے والے ہوتے ہیں۔

تاہم کتاب میں کہیں کہیں پروف کی غلطیاں اور مصنفہ کا انگریزی الفاظ کا بے دریغ استعمال میرے جیسے قاری کو تھوڑا بدمزہ بھی کر دیتا ہے۔ کاش قانتہ رابعہ اردو افسانہ لکھتے ہوئے صرف اردو ہی کو استعمال کریں۔ ہماری قوی زبان کا دامن اتنا تنگ تو نہیں کہ قانتہ کی کہانیوں کو اپنے اندر سمیٹ نہ سکے۔

ادبیات ایک معیاری ادارہ اشاعت ہے۔ اس کتاب کو بھی خوبصورت انداز میں شائع کیا گیا ہے۔ مجلد کتاب کا ٹائٹل کتاب کے نام سے مطابقت رکھتے ہوئے اپنے اندر گہرائی رکھتا ہے۔

(فرزانہ چیمہ)

☆.....☆.....☆.....☆

میرا تجربہ

سردیوں اور گرمیوں کے کپڑے سمیٹنے کا دشوار مرحلہ

موسم بہار کے آتے ہی موسموں کی تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ سردی اپنا جوبن دکھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جہاں ٹھنڈی ہوائیں، دھند میں ڈوبی سڑکیں، کہر آلود سڑکیں، زرد پتوں کی چرچراہٹ اپنا رنگ دکھا چکیں وہیں گرم ہوائیں، تپتی دوپہریں ہماری منتظر ہیں۔ ایک موسم کی رخصتی اور دوسرے کی آمد آمد ہے۔ پھر موسم کے اپنے رنگ ہوتے ہیں۔ اس کے آنے اور جانے کی تیاریاں ہر طرح سے کرنی پڑتی ہیں۔ موسم سرما جس طرح اپنے ساتھ نت نئے گرم پہناوے لے کر آتا ہے اسی طرح اس کے جانے کے ساتھ ہی ان کپڑوں کو سمیٹنے کا کام بھی شروع ہو جاتا ہے۔ اونی ملبوسات موسم سرما کی اہم ضرورت ہیں۔ یہ موسم ہر سال جدید طرز کے گرم کپڑے، شالیں، سوئیٹر، کوٹ مفلر شالیں لے کر سایہ فگن ہوتا ہے۔ دو تین ماہ ہر کوئی گرم کپڑوں کی خریداری میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ گرانی کے اس دور میں ہر سال گرم کپڑوں کی خریداری بہت مشکل کام ہے۔ سمجھ دار خواتین اپنے گرم کپڑوں کو سنبھال کر رکھتی ہیں تا کہ آئندہ برس بھی وہی کپڑے استعمال میں آ سکیں۔

موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہی گرم کپڑوں کو سمیٹنا بے حد دشوار معلوم ہوتا ہے لیکن ایک خانہ دار خاتون اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ گرم سوئٹر شالیں مفلر جو اس نے اتنے مہنگے داموں خریدے ہیں جب تک احتیاط اور ڈھنگ سے نہیں رکھیں گے ان کے ضائع ہو جانے کا احتمال ہے۔ انہیں سلیقے سے رکھیں تا کہ آئندہ سال بھی یہ کپڑے ہم استعمال کر سکیں بلکہ احتیاط برتنے سے ہم برس ہا برس تک انہیں استعمال کر سکتے ہیں۔

اونی اور گرم ملبوسات کو سمیٹنے کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انہیں کیڑوں اور گرد و غبار سے بچایا جائے۔ اس کے لیے درج ذیل طریقے اختیار کیے جائیں۔

☆.....اصل وول کے گرم سوئٹر اور شالیں مردانہ پینٹ کوٹ علیحدہ کر لیں اور سینتھٹک مکس والے سوئٹر دوسری جانب رکھ دیں۔

☆.....ایک ٹب میں نیم گرم پانی لیں اور اصلی وول کے سوئٹروں کو پانی میں بھگو دیں اور واشنگ پاؤڈر بھی ڈال دیں۔ دو گھنٹے کے بعد انہیں ٹب سے نکال کر آہستہ آہستہ ملیں اور صاف پانی سے کھنگالنے کے بعد بڑی احتیاط سے دونوں ہاتھوں سے آہستہ آہستہ دبا کر پانی نچوڑیں کہ اس میں کوئی بل نہ آنے پائے۔ ایک چارپائی یا تخت پر ململ کا کپڑا بچھا کر اس پر سوئٹر سوکھنے کے لیے ڈال دیں کہ ان کے بارڈر نہ کھلنے پائیں۔ انہیں تار پر مت ڈالیے کیونکہ تار پر ڈالنے سے یہ لٹک جائیں گے اور ان کی شیپ خراب ہو جائے گی۔ اصلی وول کی شالوں اور مردانہ پینٹ کوٹ کو ڈرائی کلین کروائیں۔

دوسری قسم کے سوئٹر اور شالیں جو سینتھٹک مکس ہیں انہیں ٹب میں دھو کر ڈرائیر یا Spinner میں سکھایا جا سکتا ہے۔

میلے کپڑے نہ سنبھالیں کیوں کہ انہیں کیڑا لگنے کا احتمال ہوتا ہے۔ بڑے بڑے شاپر لیں ان میں ایک ایک کر کے سوئٹر رکھتے جائیں اور ساتھ ہی فینائل کی گولیاں بھی ڈالتی جائیں۔ گھر کے ہر فرد کے سوئٹروں کے الگ شاپر بنائیں اور کپڑوں کے علیحدہ سے شاپر بنائیں۔ ان پر سبھی افراد کے ناموں کے سٹکر بھی لگا دیں تا کہ آئندہ

سال کپڑے نکالنے میں آسانی ہو۔

ان تمام شاپرز کو الماری کے کسی اوپر والے بند خانے، کسی بکس یا پیٹی میں رکھ دیں۔

اگلا مرحلہ رضائیوں اور کمبلوں کو سمیٹنے کا ہے۔ کچھ لوگ کور بنا کر رضائی کے اوپر چڑھا لیتے ہیں۔ ہر سال اسے اوپر سے اتار کر دھو لیتے ہیں۔ یہ بہت آسان طریقہ ہے کیونکہ ہر سال رضائیوں کو دھلوانا بہت مشکل کام ہے۔

آج کل پولیسٹر کی رضائیوں کا دور ہے جس نے مشکل کام کو آسان بنا دیا ہے۔ روئی کی رضائی کو ادھیڑنا، دھونا مشین میں پنجوانا اور پھر سلائی کروانا بہت ہی مشکل کام لگتا ہے مگر پہلے لوگ ایسے ہی کرتے تھے۔ آج بھی بہت سے لوگ روئی کی رضائی کو پسند کرتے ہیں۔ ٹین کی پیٹی یا لکڑی کا بڑا سا بکس تقریبا ہر گھر میں ہوتا ہے اس میں رضائیاں، گدے، کمبل وغیرہ رکھیں۔ ساتھ ساتھ فینائل کی گولیاں (یا نیم کے پتے) رکھیں۔ پیٹی کے چاروں کونوں اور درمیان میں فینائل کی گولیاں ڈال دیں۔ رضائیوں کے اوپر ململ یا کاٹن کا کپڑا ڈال کر پیٹی بند کر دیں۔

جدید طرز زندگی نے چھوٹے گھروں میں کم جگہ پر زیادہ گنجائش نکالنی سکھا دی ہے۔ چھوٹے گھروں میں پیٹی رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی، لوگ الماریوں کے اوپر والے بڑے بڑے خانوں کو پیٹی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان خانوں میں رضائیاں اور کمبل رکھنے کے بعد فینائل کی گولیاں ڈالنا نہ بھولیں۔

اب مرحلہ ہے گرمیوں کے کپڑوں کو نکالنے اور سمیٹنے کا۔ جن الماریوں یا بکس میں ہم نے سردیوں کے کپڑے رکھے تھے انہی میں سے اب ہم نے موسم گرما کے کپڑوں کے شاپر نکال لینے ہیں۔ اب کپڑوں کو استعمال سے پہلے ضرور دھلوا لیں کیوں کہ پچھلے چار پانچ ماہ سے کپڑے بند پڑے رہے ہیں۔ اور ان میں کافی جراثیم پل رہے تھے۔

مرحلہ وار کام کریں۔ گھر میں عموماً چھ سے سات افراد ہوتے ہیں۔ ایک دن میں ایک فرد کے کپڑے نکالیں اسے دھوئیں اور استری کر کے الماری میں رکھتے جائیں۔ اس طرح ہفتے کے سات دنوں میں کپڑے نکالنے اور رکھنے کا کام با آسانی ہو جائے گا۔ وقت بھی کم لگے گا اور کپڑے بکھرنے سے بھی بچ جائیں گے۔

بکس یا پیٹی کو دو گھنٹے کے لیے دھوپ لگوا لیں۔ پیٹی کو سٹور سے باہر نکالنا مشکل ہو تو اس کا ڈھکن کھول کر دو گھنٹے کے لیے کھلا رہنے دیں تا کہ تازہ ہوا پھرنے سے جراثیم مر جائیں۔

امید ہے اس سے ہمارے قیمتی ملبوسات گرد و غبار اور کیڑا لگنے سے محفوظ رہیں گے اور اگلے سال کے لیے قابل استعمال بھی رہیں گے۔

☆☆☆☆

کچن کارنر

موسم بہار کا انمول تحفہ.....سٹرابری کا ملک شیک

اجزا: تازہ دودھ 1 کلو، سٹرابری 1/2 کلو، چینی حسب ذائقہ

ترکیب: گرائنڈر مشین کے جگ میں دودھ، دھلی ہوئی سٹرابریز اور چینی ڈال کر گرائنڈر کو دو سے تین منٹ تک وقفے وقفے سے چلائیں۔ تھوڑی سی برف بھی پیس کر شامل کر لیں۔ مزیدار شیک تیار ہے۔

سٹرابریز بہت کم عرصے کے لیے بازار میں دکھائی دیتی ہیں۔ انہیں خرید کر ڈیپ فریزر میں رکھ لیں اور وقفے وقفے سے ملک شیک بنا کر موسم بہار اور ملک شیک کا لطف اٹھائیں۔

اچار اور چٹنیوں سے کھانے کی لذت دوبالا کریں

گرمی کے موسم کی آمد آمد ہے اور گرمیوں میں اچار اور چٹنی کا استعمال کھانے کی لذت دوبالا کر دیتا ہے اور بھوک بھی بڑھاتا ہے۔

آم کا اچار

اجزاء:۔ کچے آم 1 کلو، سرخ مرچ 1 چمچ، میتھی دانہ 1 چمچ، سونف 2 چمچ، زیرہ 1 چمچ، نمک حسب ضرورت، کلونجی ثابت 1 چمچ، رائی کے دانے 1 چمچ، سوکھا دھنیا 1 چمچ، سرسوں کا تیل 750 گرام۔

ترکیب:۔ آم دھو کر خشک کر لیں۔ آموں کے دو ٹکڑے کر لیں اور گٹھلیاں نکال دیں۔ آم بالکل خشک ہونے چاہئیں۔ ململ کا کپڑا دھوپ میں کسی میز یا چارپائی پر پھیلا دیں اور 4، 5 گھنٹے کے لیے کٹے ہوئے آموں کو دھوپ میں سکھا لیں مکھیوں سے بچاؤ کے لیے باریک جالی دار کپڑے یا ململ کے کپڑے سے ڈھانپ دیں۔

سونف، میتھی دانہ اور کلونجی کے علاوہ تمام مصالحہ موٹا پیس لیں۔ اب تمام مصالحے ملا لیں۔ ان میں تھوڑا سا تیل شامل کر لیں۔ اب کھلے برتن میں آم ڈال کر اوپر یہ مصالحہ ڈال دیں اور مصالحے اور آم کے ٹکڑوں کو اچھی طرح مل لیں۔

اب یہ تمام آمیزہ مرتبان میں الٹ دیں۔ مرتبان پر اچھی طرح ڈھکن لگا دیں اور دو تین دن تک روزانہ اسے دھوپ میں رکھیں۔ چوتھے دن بقیہ تیل گرم کر کے ٹھنڈا کر لیں اور مرتبان میں ڈال دیں۔

پندرہ دن میں اچار کھانے کے قابل ہو جائے گا۔ صبح شام مرتبان کو ہلاتے رہیں یا پھر لکڑی کے صاف اور خشک چمچ سے اسے آہستگی سے ہلائیں۔

نوٹ:۔ اگر آپ کو اچار میں سفید چنے پسند ہوں تو ایک کلو آم کے اچار میں ایک پاؤ سفید چنے اس طرح ڈالیں کہ چنے رات کو بھگو کر رکھ دیں صبح پریشر کُکر میں ابال لیں، انہیں بھی آموں کی قاشوں کے ساتھ ہی دھوپ میں خشک کر لیں تاکہ ان کا پانی خشک ہو جائے اور اچار کے مصالحے میں چنے بھی شامل کر لیں۔

مصالحہ بھرے لیموؤں کا اچار

اجزاء:۔ کاغذی لیموں 30 عدد (بڑے بڑے)، سرخ مرچ حسب ذائقہ، کالی مرچ 8، 10 عدد، بڑی الائچی 3، 4 عدد، نمک 1/2 پاؤ، زیرہ 1/2 چھٹانک، لونگ 1 چٹکی، سونف 1/4 چھٹانک۔

ترکیب:۔ لیموں دھو کر اچھی طرح خشک کر لیں۔ پھر ان کی چار چار پھانکیں اس طریقے سے بنائیں کہ ان کا نچلا حصہ علیحدہ نہ ہو اب

تمام مصالحے نمک مرچ ملا کر باریک پیس لیں۔

پسا ہوا مصالحہ لیموؤں کے کٹے ہوئے حصوں میں بھر دیں اوپر سے دس لیموؤں کا رس نچوڑ کر مرتبان کا منہ اچھی طرح ڈھکن لگا کر بند کر دیں۔ آٹھ دس دن تک روزانہ دھوپ میں رکھیں بارہ دن تک اچار کھانے کے قابل ہو جائے گا۔

سادہ لیموؤں کا اچار

اجزاء:۔ کاغذی لیموں بڑے سائز کے 1 کلو، نمک، سرخ مرچ حسب ذائقہ۔

ترکیب: لیموں دھو کر خشک کر لیں پھر آدھے لیموؤں کی دود دو پھانکیں کاٹیں۔ آدھے لیموؤں کا رس نکال لیں۔ کٹے ہوئے لیموؤں کو اس میں ڈبو دیں۔ حسب ذائقہ نمک مرچ ملا لیں۔ مرتبان یا جار کو روزانہ دھوپ میں رکھیں۔ دس بارہ دن بعد اچار کھانے کے لیے تیار ہے۔

کچے آموں کی چٹنی

اجزاء: کچے آم تقریباً 1 کلو، کلونجی ایک چائے کا چمچ، ادرک 100 گرام، چینی 1 کلو، نمک و سرخ مرچ حسب ذائقہ۔

ترکیب: آموں کو دھو کر خشک کر کے چھیل لیں اور آٹھ آٹھ پھانکیں کر کے ادرک کاٹ کر ملا دیں۔ ادرک کو لمبائی کے رخ باریک باریک کاٹ لیں۔ کلونجی، نمک، مرچ بھی ڈال دیں اور کھلے منہ کے برتن میں ڈال کر اوپر ململ کا کپڑا باندھ کر دو روز دھوپ میں رکھ دیں۔ دن میں دو تین مرتبہ خشک چمچ سے ہلا دیں۔

تیسرے روز چینی ملا کر چولہے پر رکھ کر پکا لیں۔ دو تار کی چاشنی تیار ہو جائے تو چولہا بند کر کے ٹھنڈا ہونے دیں۔ پھر صاف اور خشک بوتلوں میں بھر لیں۔ سال بھر خراب نہ ہوگی۔

☆☆☆☆

بتول میگزین

شادی نہیں سادی

(پروین شاکر، لیہ)

میں نے بچوں کے سکول جانے کے بعد جلدی جلدی کام ختم کیا کیونکہ مجھے اطلاع ملی تھی کہ پڑوسن کے بیٹے کو نوکری مل گئی ہے میں اسے مبارک باد دینا چاہتی تھی میں جیسے ہی ان کے گھر میں داخل ہوئی وہ والہانہ انداز میں میری طرف بڑھیں۔

''مبارک ہو آپا! آپ کے بیٹے کو نوکری مل گئی۔'' میں نے سلام کے بعد کہا۔

''خیر مبارک، خیر مبارک'' آپا نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور مجھے اپنے تخت پوش کے قریب بچھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں وہاں بیٹھ گئی۔''کہاں نوکری ملی ہے؟'' میں نے وضاحت چاہی۔''سرکاری نوکری ہے۔ ماشاءاللہ بیٹا بہت خوش ہے۔'' آپا نے جواب دیا۔

''اب جلدی سے اس کا گھر بسا دیں۔'' میں نے آپا کو مشورہ دیا۔''میری خواہش تو یہی ہے لیکن تم تو جانتی ہو مہنگائی کس قدر بڑھ گئی ہے۔ سونے کا بھاؤ آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ ابھی تو نوکری ملی ہے دو تین سال تو لگیں گے شادی کے قابل ہونے میں۔'' آپا نے دل کی بات کہہ دی۔

''دو تین سال.....؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ظاہر ہے دلہن کا زیور، لباس اور شادی کا کھانا ہی بہت بڑا خرچہ ہے۔ میرے پاس تو تھوڑی سی رقم رہ گئی ہے۔ سب کچھ بیٹیوں کی شادیوں پر لگ گیا خیر سے اس وقت تو بچوں کا باپ سلامت تھا اب تو وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ اب تو جو بیٹا کمائے گا اس کی کمیٹی ڈال لوں گی اور پھر جیسے ہی بڑی رقم جمع ہو جائے گی اس کی دلہن لے آؤں گی۔'' آپا نے اپنی منصوبہ بندی بتائی۔

''آپا آپ کی بات تو ٹھیک ہے لیکن ضروری تو نہیں کہ شادی پر بہت سے لوگوں کو بلایا جائے اور سونے کا زیور دینا کوئی شرط تو نہیں ہے میرے بھائی کی شادی پچھلے مہینے ہی ہوئی ہے ہم نے نہایت سادگی سے بغیر سونے کے زیور کے شادی کر دی۔ آپا ہم لوگوں نے خود ہی معیار بلند کر لیے ہیں آپ ہی بتائیں کوئی حدیث یا کوئی قرآنی آیت ہے جس میں سونے کا زیور دینا یا بہت سے لوگوں کو بلانے کا حکم دیا گیا ہو۔ اپنی حیثیت کے مطابق جو کچھ ہو سکے کر دینا چاہیے۔ ہم لوگوں نے زیادہ کی لالچ میں بچوں کے نکاح کو مشکل اور زنا کو آسان بنا دیا ہے۔ بچے انتظار میں ادھر ادھر دوستیاں کرتے پھرتے ہیں بے چارے والدین کے سامنے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے میری مانیں تو اس کی شادی سادگی سے کر دیں اور گھر میں بہو لے آئیں۔ رہی زیور کی بات تو وہ قسمت میں ہوا تو پھر بن جائے گا۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ آپ کی بہن کی بیٹی ہی تو ہے خیر سے وہ بھی دیندار ہے بات سمجھ جائے گی بیٹی کو گھر میں بٹھانے سے بہتر ہے کہ سادگی سے اس کے ہاتھ پیلے کر دیئے جائیں۔'' میں نے آپا کو پیار سے سمجھایا۔

''اور لوگ کیا کہیں گے، رشتہ دار برا نہ منائیں گے کہ ان کو شادی پر نہیں بلایا گیا۔'' آپا نے خدشہ ظاہر کیا۔

''آپا لوگوں کی خوشی کی خاطر خدا کو ناراض نہ کریں۔ ہمارے پیارے نبیؐ نے بچیوں کی شادی جلد کر دینے کا حکم دیا ہے

آپ کی بھانجی بھی تو آپ کی اپنی بیٹیوں کی طرح ہے کیا آپ نہیں چاہیں گی کہ اس کی شادی بھی مناسب وقت پر ہو جائے۔'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں! چاہتی تو میں بھی یہی ہوں پر سوچتی ہوں نجانے بہن مانے گی یا نہیں۔'' آپا نے جواب دیا۔

''آپ بات کر کے تو دیکھیں انشاء اللہ مجھے قوی امید ہے کہ وہ مان جائیں گی۔ اچھا میں چلتی ہوں کھانا بھی بنانا ہے۔'' یہ کہہ کر میں چلی آئی۔ آپا نے اسی رات بہن کو فون کیا اور شادی کی آفر بھی کر دی۔ بہن فوراً مان گئی اور اس طرح دونوں نے خدا اور رسولؐ کے فرمان کے مطابق سادگی سے شادی کر دی۔

''آپا مبارک ہو بہو گھر آ گئی۔'' میں نے آپا کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''خیر مبارک، خیر مبارک۔'' یہ سب تمہارے ہی مشورے پر عمل کرنے سے ہوا۔ واقعی میں تو شادی کو بہت بڑا بوجھ تصور کر رہی تھی لیکن یہ تو بہت آسانی سے ہو گیا۔'' وہ بہت خوش تھی۔ آپا! شادی کے لفظ میں سے اگر شین کے تین نقطے مٹا دیئے جائیں تو وہ سادی بن جاتی ہے۔ بس ہم نے تو وہ تین نقطے مٹائے ہیں اور خدا اور رسولؐ کو راضی کیا ہے۔ خدا ہم سب کو ایسی ہی شادیاں کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

نوجوان نسل سے شکوہ آخر کیوں.....؟

(ام صائم، لاہور)

آج ہر کوئی اپنی اولادوں کا اور نوجوان نسل کا شکوہ کرتا نظر آتا ہے.....آخر کیوں.....؟

آخر ہم اپنی اولادوں کو دیتے ہی کیا ہیں پھر یہ شکوہ کیوں.....؟ ساری عمر لاپروائی میں گزار دی۔ بڑی حد ہے تربیت کی بھی تو یہی کہ زیادہ سے زیادہ نماز کے لیے سختی کر دی یا قرآن پاک قاری صاحب سے مکمل کروا لیا۔ اور پڑھائی کی طرف توجہ دلاتے رہے کہ بڑا آدمی بننا ہے پیسہ کمانا ہے ڈگریاں لینی ہیں۔

اگر کبھی بچے نے کوئی سوال کر دیا تو اسے جھڑک دیا چاہے وہ سوال کسی بھی قسم کا ہو، دین کا یا دنیا کا.....اور بچوں کو ہوش سنبھالتے کھلونوں میں مصروف کر دیا یا ٹی وی پر کارٹون لگا کر بٹھا دیا تھوڑے سے اور بڑے ہوئے تو ویڈیو گیمز پکڑا دیں تاکہ ہماری اپنی جان چھوٹی رہے۔ نہ بچے کو وقت دیا نہ اس کے ساتھ کھیلے نہ مل کر گپ شپ لگائی نہ کوئی بحث و مباحثہ۔ نہ یہ بتایا کہ اللہ اور اس کے رسول نے کیا طریقہ بتایا ہے زندگی گزارنے کا، ماں باپ کا رتبہ کیا ہے۔

اور جب بچے شعور کی منزلیں طے کر گئے اور والدین کو ہوش آیا یا اللہ پاک انہیں قرآن کی طرف لے آیا تو لگے چیخنے کہ ہم اپنی اولادوں کا کیا کریں۔ یہ احترام نہیں کرتے..... دین کو نہیں سمجھتے بدتمیزی کرتے ہیں۔

تو اپنے گریبان میں جھانکیے کیا جب بچہ اس دنیا میں آنے والا تھا تو آپ نے کتنی دین کی پابندی کی۔ کیا آپ پابندی نماز قرآن کرتے رہے کیا آپ نے اپنے بچے کے لیے کبھی یہ دعا کی کہ اللہ ہمارے بچے کو نیک متقی اور اپنی شریعت کا پابند بنانا۔

کیا بچے کو اپنا دودھ پلایا اور دودھ پلاتے ہوئے بسم اللہ پڑھی اور تلاوت..... یا پھر ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر فلمیں اور ڈرامے دیکھتے رہے۔ کیا قرآن کی تلاوت اس بچے کے کانوں تک پہنچائی یا ڈیک پر میوزک لگا چھوڑا۔ کتنی ایسی مائیں ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کو قرآن کا علم دیا۔ اگر آپ ان کی پیدائش سے پہلے ہی سے اپنے عمل پر نظر رکھیں تو میرا دعویٰ ہے کہ آج کسی ماں کو کوئی شکوہ نہیں ہوتا۔ آخر وہ بھی تو مائیں ہی تھیں جنہوں نے محمد بن قاسم، علامہ اقبال اور قائداعظم جیسی ہستیوں کو جنم دیا۔

نوجوان نسل بری نہیں برے ماں باپ ہیں جنہوں نے انہیں سیدھا راستہ نہیں دکھایا۔ آج کی نوجوان نسل بھٹکی ہوئی ہے۔ ہمارا معاشرہ فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔ اسے رہنمائی نہیں مل رہی کہ وہ کیا راستہ اختیار کرے۔

آپ عمر کی کسی بھی منزل پر ہیں قرآن کو سمجھیں پھر اس پر عمل شروع کر دیں میرا تجربہ اور دعویٰ ہے کہ اللہ آپ کو مایوس نہیں کرے گا دراصل زبان سے کہی ہوئی باتیں وہ کام نہیں کرتیں جو آپ کا عمل کرتا ہے عمل کے ساتھ دعائیں بہت ضروری ہیں۔

میرا اپنا تجربہ تو مجھے یہی بتاتا ہے کہ ہم ان بچوں اور جوانوں کو ان کی کسی غلطی پر سرزنش نہ کریں بلکہ انہیں یہ بتائیں کہ ہمیں کرنا کیا ہے اور پھر اپنے عمل سے انہیں اس طرف لائیں انہیں قرآن کی آیات و احادیث کا حوالہ دیں انہیں بتائیں کہ یہ غلطی ہم میں بھی تھی ہم نے فلاں آیت کو سمجھا یا حدیث پر عمل کیا تو اللہ پاک نے ہماری مدد کرتے ہوئے ہماری رہنمائی فرمائی اور ہماری زندگی میں بہتری آئی۔

انہیں بتائیں قرآن کا علم آپ میں اعتماد پیدا کرے گا۔

ہم لوگ گھبرا اس لیے جاتے ہیں کہ لوگوں سے ڈرتے ہیں لوگ کہیں گے یہ خود تو ساری برائیاں کرتے رہے اب ہمیں نصیحتیں کرتے ہیں۔لیکن ہمیں ان باتوں کا سامنا کرنا ہوگا اور اپنے ارادے پر قائم رہنا ہوگا۔

ہمیں اپنے بچوں کو، نوجوانوں کو سیدھا، سچا راستہ دکھانا ہے انہیں بتانا ہے کہ آج بھی اللہ ہم پر اسی طرح مہربان ہوسکتا ہے جیسے جنگ بدر کے مسلمانوں پر تھا۔

☆☆☆

ذات کا دکھ

(مسز منصور، لاہور)

ذات کا دکھ بھی عجیب چیز ہے کبھی دل کے نہاں خانوں میں اتنا شور برپا کرتا ہے کہ اس میں نبض کی آواز ڈوب ڈوب جاتی ہے کبھی دل کو خون کے آنسو بھی رلا دیتا ہے۔ جب اس کا بسیرا آنکھوں میں ہوتا ہے تو چمکدار موتی بن کر تیرتا رہتا ہے کبھی واویلا بن کر زبان کا رخ کرتا ہے۔ بہت ہی بے مروت ہے، اپنے ٹھکانے بدلتا رہتا ہے۔

☆☆☆

ہمارا کیا ہے؟

(تانیہ گلزار کراچی)

پاکستان کے پرائیویٹ چینلز پر ہر وہ چیز جو ہماری تہذیب سے الگ ہو پروان چڑھتی نظر آتی ہے۔آخر کیوں ہمارے ارباب اختیار کو ان چینلز کی یہ روش نظر نہیں آتی؟

14 اگست کو ہی دیکھ لیں تو تمام پرائیویٹ چینلز کے Icon ہرے ہو جاتے ہیں۔اسی طرح محرم میں کالے ہو جاتے ہیں۔ بسنت میں پتنگیں بنی نظر آتی ہیں۔ ویلنٹائن میں لال دل نظر آتے ہیں۔لیکن یوم کشمیر پر ایک ''پتہ'' بھی لٹکتا نظر نہیں آتا۔ پتے کی بات تو الگ ہے ان چینلز پر یوم کشمیر کے حوالے سے کوئی ڈرامہ نہیں دکھایا جاتا۔تمام پرائیویٹ چینلز والے مغربی تہذیب کو تو اس قدر ترویج دیتے ہیں کہ ہمیں نعوذ باللہ یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے یہی تو ہماری تہذیب ہے۔ان چینلز کو اب ہم ''ہمارے'' چینلز بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان پر کچھ بھی ہمارا نہیں، سب غیروں کا دکھائی دیتا ہے۔ چہرے ہمارے، باتیں غیروں کی، انداز غیروں کے، زبان غیروں کی، نقالی ان کی، رسم و رواج ان کے مفادات کا تحفظ ان کا.....آخر ان پر ہمارا کیا ہے۔

محشرِ خیال

دو دن میں سارا بتول پڑھ ڈالا، (فروری) مہینے کے بالکل درمیان میں موصول ہوتا ہے اس وقت تک اس سے پہلے موصول ہونے والے ماہانہ رسائل تقریباً پڑھے جا چکے تھے۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ''بتول'' بھی پہلے ہفتے میں مل جایا کرے۔ تاکہ تازہ تازہ پڑھا جا سکے۔

اس دفعہ کے بتول میں سیرت کا گوشہ بہت گہرا اور دیرپا اثرات لیے ہوئے تھا۔ خصوصاً بشریٰ تسنیم کا افسانہ بہت پسند آیا..... میں نے اس شعر کو بہت اچھی طرح یاد کر لیا اور اس کو سمجھنے میں بہت مدد کی۔ نجمہ سہیل نے ہلکے پھلکے انداز میں بہت اہم موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ واقعی اس طرح کے بہت سے کردار ہمارے اردگرد موجود ہیں۔ بتول میگزین بھی بہت کام کی چیز ہے۔ بعض اوقات بہت چھوٹی اور معمولی بات کو پراثر انداز میں سمجھایا جاتا ہے۔

(راضیہ حسن.....لاہور)

☆.....☆.....☆.....☆